www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

میرا بہترین افسانہ

urdukutabkhanapk.blogspot

مُرتبہ

محمد حسن عسکری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میرا بہترین افسانہ

ناز لائبریری
افضال بلاک کیٹ نزد کے ایم سی مارکیٹ
B/6 کمرشیل ایریا ناظم آباد نمبر 2 کراچی

مسرور لائبریری
50 دکان نمبر 15 - بلاک نمبر
سکیم نمبر سوسائٹی - کراچی

مرتبہ

محمد حسن عسکری

Scanning Project 2015

Book No.58

Donated By:
Dr. Moin uddin Aqeel

Special Courtesy :
Salman Siddqui

.

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ ان میں کس مدرسۂ فکر کی پیروی کی گئی ہے، نہ اُن سے کوئی سبق اخذ کرنے کی کوشش کیجئے۔ ان کی اداس وَدَر کی اضافی قدر و قیمت کچھ ہوا کرے، آپ صرف ایک بات پر غور کیجئے۔ کیا یہ آرٹ ہے؟ کیا یہاں زندگی ایسی ٹھوس شکل میں پیش کی گئی ہے کہ جہاں وہ اصل سے سوگنا زیادہ باترتیب، زندہ، حساس اور پر معنی ہے؟ کیا یہاں بے نام چیزوں کو نام مل گیا ہے؟ کیا یہاں زندگی کے خام مواد سے ایسی صورتیں تخلیق کی گئی ہیں جو جیتے جاگتے انسانوں سے بھی زیادہ حقیقی ہیں — بقا کی پروردہ؟ کیا یہ افسانہ ہماری رگوں میں ایسے آگ آیا ہے جیسے زرخیز مٹی میں پودا؟

اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوس نہیں ہونا پڑے گا۔

محمد حسن عسکری

۳۰۔ جون ۱۹۴۳ء

فاز لائبریری
الطال سارکیٹ نمبر ۔ کے ایریا سی سارکیٹ
B/6 کمرشیل ۔ فیز ۱ ناظم آباد نمبر 2 کراچی

جملہ حقوق بحق ساقی بکڈپو دہلی محفوظ

(مطبوعہ محبوب المطابع۔ دہلی)

طبع دوئم

قیمت عہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اوپندر ناتھ اشک

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا، اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے

سردیوں کے مختصر سے دن کو گزرے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا سا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی سی بنیان، اس پر جھوٹا گرم انڈرویر، اس پر موٹے کھدر کی قمیص، اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست، دسمبر کی تھکی، ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا۔ تو وہاں میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لاکر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی! میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام کے ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟"

"میرے پاس کپڑا ہے بابوجی!"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی مٹی کے تیل کا گرم تیز بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔" وہ کہا کرتے ہیں۔ "اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے ——— اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے میں بارہا محسوس بھی کرتا ہوں۔ لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے۔ میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو میں اٹھ کر پھر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے، کچھ اس طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے گرد لپیٹ میں کام پر آ بیٹھتا

بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برابر برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا۔ اور "کمیونٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ بینگن کا پودا دو بار پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا سکڑا پچکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا پڑی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی لیکن وہ بے حد ضعیف دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ، پالس کی ٹانگیں، سوکھا چہرہ اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ——— بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہاگنا بھی چھانٹے پر بڑھتا ہے۔ دنیا میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹے پر پہلے سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ تو پھر انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا۔ انسان کی بیل بھی تو اُمر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد عورتیں، بچے، بوڑھے اس کے پھل پھول اور شاخیں جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انھیں کاٹ دیتی ہے۔ اور ان کی جگہ نئے ہرے بھرے زندگی سے بھرپور اچھلتے، کودتے ناچتے گاتے پھول اور پتے لگتے ہیں اور زندگی کی امر بیل بڑھتی ہوئی پھولتی پھلتی جھومتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں آ پڑا ہے۔ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا تھا "ارے بھئی تم ہو کون؟"

"میں جی۔ ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

بوڑھا کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا

فار لائبریری
اقبال مارکیٹ نزد کے ایم سی مارکیٹ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کو وہ رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور بیوی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں ـــــ بیاہنے کے قابل ـــــ اور وہ روزگار کے لیے ماہی رام کے ساتھ آگیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لیے ناممکن ہوگیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں۔ اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پر شاید ایک میلی پھٹی دلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے ـــــ قریب قریب چگل کر میں نے کہا "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے! برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو؟"

لیکن اس وقت سمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے ماہی رام ـــــ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازہ پر آکھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی۔ اس کے نیچے کالا موٹا کمبل گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتہ۔ ایک دن چھ مولیوں کے لیے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا۔ اور اسے پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابوجی" ماہی رام نے کہا "نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو دن دیکھتے ہو گئے ہیں۔ ایک رات گوبھی کے دس پھول غائب تھے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکتے ہوئے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچھ کو بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر دو سو روپیہ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ سب بھی تو اسی میں سے پورا کرنا ہے۔ اور پھر مزدوروں کی مزدوری"....

"لیکن ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے" میں نے کہا "یہاں تو کبھی

چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی بھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں"

"نہیں بابوجی باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آسکتا"

"لیکن اس دن مٹولیاں....."

"وہ اور بات تھی بابوجی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔ جاتے جاتے اکھاڑ کرتے گیا۔ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر کو کان ہو جائیں" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر اسے چاہو تو اندر سلا دو"

"نہیں بابوجی سردی تو امیروں کو لگتی۔ اسے تو بونہی محض دکھاوے کے لیے یہاں سلا دیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا ـــــ ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے کوئی آیا کہ میں نے اسے دبوچا" اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے؟....."

"کافی ہیں بابوجی"

اور یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن کام مجھ سے ہو نہ سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس ـــــ دھن، دولت اولاد اور بے فکری کی وجہ سے اس کے گال اس پچاس برس کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے ـــــ اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گرم اپنے کمرے میں مزے سے لیمپ ہانک رہا ہوگا، تاش اور شطرنج میں مشغول ہوگا۔

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا۔ اور کمرہ خوب گرم تھا ـــــ میں اٹھا کچھ ضروری کاغذ اور قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل سویرے ذرا جلدی اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے میں تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن "نہیں نہیں بابو جی میرے پاس کافی کپڑے ہیں" اس کا یہ جواب سن کر میں قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر میں نے کمبل ڈالیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لیے۔ اور پھر انھیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے ـــــ بے ربط بے ترتیب۔ لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہوگئیں اور پھر بند۔

سوتے سوتے کبھی ماہی رام، کبھی اس بوڑھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا۔ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے۔ اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں تک لے گیا ہے۔ سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے چور نہایت درد بھری نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ چور ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں۔ ڈھی گھٹا ہوا سر دہی بھولے ہوئے گال اور چپٹی ناک۔

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی ہے۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ بھاری ہے اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

میں نے سرہانے رکھے لوٹے سے پانی پیا۔ اور پھر لحاف کو اچھی طرح سے اوڑھ کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ شاں شاں ـــــ شاں شاں ـــــ اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے۔ پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑ رہے ہیں۔ کیاریوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ صرف اسی مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی ہو گئی۔ گھٹنوں کو پاؤں میں لپیٹ کر سینے سے لگائے وہ سکڑا سمٹا اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پر لگتے ہیں اور وہ اس بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے "بوڑھا مر گیا۔ بوڑھا پھانسی لگا کر مر گیا"

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا مر گیا" کی آواز آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے ..... کڑکڑ..... کڑکڑ.....

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کوئی زور سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔

جلدی سے گرم جرابیں پہن، سر پہ ٹوپی پہن اور کمبل کو اچھی لپیٹ کر میں اٹھا،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سکریٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات آپکے برآمدہ میں بوڑھا مرگیا۔"

میں نے دیکھا۔ اس میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارگرد وہی میلا کچیلا لحاف لپیٹے بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا....." میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سکریٹری صاحب نے میری بات کو کاٹ دیا: "میں چائے کے لیے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا" وہ بولے "کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ٹھیکیدار کے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

اگلے دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک ٹرک کر میں نے ماہی رام سے کہا "غدا کے لیے اس پیلے سے بیگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔"

میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران میری طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے کہا۔

"بہت اچھا سرکار!"

اختر اورینوی

انارکلی اور بھول بھلیاں

اس نے ایک خواب دیکھا ــــ رات بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ رسالہ کا چھوٹا سا دفتر بس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی، اس میں ایک دروازہ جو بڑے بے ربط سے ہال میں کھلتا تھا۔ اور ایک دریچہ جس سے گلی کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا۔ گلی کے اس جانب چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی ایک بے حس بیگانہ سی دیوار۔ ماضی کی مجرد رسموں سے یا بہ گل توہمات کی طرح کھڑی ہوئی کھلے آسمان کے نظارے کو روکتی تھی۔ بے ربط سا ہال بس ایک اونچا سا شڈ تھا۔ یہاں آہنی پریس گھڑگھڑاتا رہتا تھا۔ چرخی چلتی تھی تسمے گھومتے تھے۔ دندانے وصل ہو ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ دستے تختیوں کو لیے ہوئے قیام، رکوع اور سجدہ کیے جاتے تھے اور سفید کاغذ کے سینے گیہنے بن جاتے۔ صفحات پر سطریں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سویرے سویرے سائرن بجنے کے بعد میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے مزدوروں کی قطاریں فیکٹری میں جا رہی ہوں۔ پریس گھڑگھڑاتا رہتا۔ اس کے دماغ دوزشور سے اکتا کر وہ گلی میں دیکھنے لگتا۔ وہاں بھی موٹی عورتیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیلی لڑکیاں، گندے مرد، محلہ کے لڑکے نلکے پر لڑائی دنگا کرتے رہتے۔ خوانچہ والے سودے کے اعلان کو کان میں ٹھونستے ہوئے گذر جاتے۔ اس کی میز دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ اس پر روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار اخبارات، رسالے، مصور و غیر مصور جریدے ڈھیر کے ڈھیر پڑے رہتے۔ اور معمولی سے قلم دوات، بالکل معمولی اس کی کتنی کہ ایک سلیقہ کی میز ہوتی۔ میز پوش، گلدان، گھڑی، قاعدہ کا قلمدان، ایک اچھا سا بک شلف، وہ ایک حسن مذاق رکھنے والا ادیب تھا۔ مگر ملازم، مطبع اور رسالوں کا پبلشر اس بات کا قائل تھا کہ کم سے کم دانہ گھاس پر ایک ادنیٰ سے اصطبل میں رکھ کر گھوڑے کو زیادہ سے زیادہ دوڑایا جائے۔ گھوڑے کا وہ مالک تو نہ تھا۔ کرایہ کا گھوڑا، بھاڑے کا ٹٹو۔ یہ گیا وہ آیا۔ سب گھوڑے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ اور گھوڑے بہت ہیں۔ کرائے کا ادیب اور بھاڑے کا ٹٹو۔ ادیب بہت ہیں۔

غرض دریچہ اس کے داہنے کان کے بالکل متصل تھا۔ اور گلی کی ہانک پکار اس کے کان میں یوں داخل ہوتی تھی جیسے وہ لاؤڈ اسپیکر کا بھبا ہو۔ "سردے ہیں جی پشاوآر کے سردے"

"دودھ بجری دا ہیم بے والا! یوم بی والا!" اور کوئی شوخ چشم رتال تو بس اس کے کان سے لگ کر زور سے کہتا ہے "پائی جی! تھاڈی تقدیر دی گتھیاں سلجھا واں۔ ہاتھ دکھلاؤ زائچہ بنواؤ۔ بیشک جو چاہو پوچھ لو"

وہ چونک پڑتا۔ اس کا جی چاہتا کہ رتال کا سر سامنے کی بے حس دیوار سے ٹکرا دے۔ مگر ہوتا یہ کہ دیوار خود اسی سے ٹکراتی رہتی۔ گلی کی الجھن سے تھک کر وہ اپنی میز پر رکھے ہوئے مسودوں کو الٹنا پلٹنا۔ کچھ لکھنے لگتا۔ لکھتا جاتا۔ یک بیک پریس کی گھڑگھڑاہٹ زبان اختیار کر لیتی۔ کچھ کے لگانے والی زبان۔ اس کا مضمون چھپتا ہے اور ناقدین کی کٹکچھری۔ اسے ناقدوں کی کیا پروا

ہوتی وہ ان کے پورے قبیلے کو پریس کے شیخے میں کچومر بنا کر رکھ دیتا اور اسے اتنی بھی حس نہ ہوتی جتنی سگریٹ یا سلائی کے خالی ڈبے کے کچل جانے سے ہوتی ہے۔ مگر ناقدین کی آواز پریس کے کان میں گھستی چلی جاتی ہے۔ اور غرض وہ زکا اثر قبول نہ کرنے والی ہستی یوں اثر پذیر ہوتی ہے جیسے بٹن دبانے سے الیکٹرک مشین پریس کا رولر ——— معاذاللہ! تخفیف مشاہرہ کی دھمکی اور برطرفی کے قاتل اشارات۔ تو پریس کی گھڑگھڑاہٹ ناقدوں کی جاں گسل آواز معلوم ہوتی۔ وہ مڑکر نفرت سے شیڈ کے اندر بھاری بھرکم پلانٹ کو دیکھتا۔ اور پھر خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبہ کے ساتھ آنکھیں پھیر لیتا۔ پریس میں کمپوزیٹر اور دوسرے عمال اسے فراعنہ ان حبشی غلاموں کی طرح دکھائی دیتے جن سے جلادی کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ پھر لکھنے لگتا۔ اسے کیا کیا نہیں لکھنا پڑتا تھا۔ اداریے، افسانے، نظمیں، علمی مضامین۔ پروف دیکھنا بھی اسی کے سپرد تھا اور پریس کے انتظامات بھی۔ لکھتے لکھتے وہ سوچنے لگتا کہ پریس اور رسالوں کا عملہ رومی غلاموں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آپس میں لڑ لڑ کر مرجایا کرتے تھے۔ اسے پریس مین، کمپوزیٹر اور اپنے پر رحم آنے لگتا۔ اس کی نظریں کوٹھڑی کے اس گوشے میں پڑی ہوئی آرام کرسی کی طرف اٹھ جاتیں جس پر فربہ جسم پبلشر روزانہ ایک دو گھنٹے آکر بیٹھا کرتا تھا۔ اور ترقی کے خواب دیکھتا رہتا۔

رات وہ اسی دفتر میں بیٹھا بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ دو رسالوں کا سالنامہ سر پر تھا۔ ماہوار اور ہفتہ وار جریدوں کی ساری ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر تھی۔ اسے اسی طرح اور کئی بے خواب راتیں گذارنی تھیں۔ گذشتہ رات کو اس نے ایک خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا۔ انارکلی بازار سجا ہوا ہے اپنی ساری پرکاریوں اور رنگینیوں کے ساتھ اپنی رنگ برنگ بھرپور دکانوں کو لئے ہوئے آمدورفت، خرید و فروخت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اکل و شرب نمائشیں اور حسرتیں، زندگی کی حرارت روانی اور تنوع کو پیش کر رہی تھیں۔ خواب کی دُنیا عجیب ہوتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ انارکلی سے ملحق لیکن اس کی سطح سے بلند مال روڈ اس کا زرین آسمان، انارکلی اور مال کے گرد اونچی اونچی آہنی دیواریں حائل ہیں۔ آہنی مگر شفاف، وہ باہر کھڑا کھڑا سارا منظر دیکھ رہا ہے۔ ان دیواروں سے پرے چھوٹی چھوٹی پُرپیچ گلیاں ہیں۔ اور اندھے راستے، یہ ابھی ہوئی گلیاں سب کی سب انارکلی کی طرف جانے کی سعی کر رہی ہیں۔ مگر گتھا گتھا کر بھول بھلیاں بن گئی ہیں۔ خواب ہی میں اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ پتلی پتلی گلیاں اس کی گردن میں پھندا بن کر لپٹتی جاتی ہیں۔ وہ بے تحاشا انارکلی کی طرف دوڑتا ہے مگر آہنی دیواروں سے ٹکرا کر گر پڑتا ہے۔ مال کی بلندیوں سے کچھ لوگ اسے گرتے دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں اس دل قہقہے کی نشریت سے بوکھلا کر وہ جاگ اٹھا۔

یہ تھا اس کا خواب۔ دن بھر وہ خواب کی گرانی محسوس کرتا رہا۔ وہ اس غیر مرئی بوجھ کو ٹپک دینا چاہتا تھا تاکہ سالناموں کی اشاعت کے انتظامات میں منہمک ہو جائے۔ مگر خواب بھوت کی طرح سوار تھا۔ آج حالات اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہے تھے۔

وہ بس ایک ادیب ہو کر رہ گیا تھا۔ کالج میں تعلیم حاصل کرتے وقت ادب تو محض اس کی خوبصورت ٹائی جیسا تھا۔ وہ ذوق ادب کے اعلان سے اپنی نوجوان شخصیت کی آرائش کا کام لیتا تھا۔ ورنہ اس کی تمنائیں تو آئی سی ایس کے ملاء اعلیٰ پر جا پہنچتی تھیں۔ حکومت کے گنگرے کو تحمل سے مس کرنا کالج کی طویل خوش خرام زندگی کے لیے پڑدل ہوتا ہے۔ زندگی کے ٹھوس مطالبات آرزوؤں کی حدت سے نقطۂ احراق پر پہنچ کر گیس ہی جاتے ہیں۔ اور تصورات کی پھکی چلنے لگتی ہے۔ پرواز خیال کے آگے ہربجین اور اسپٹ فائر کی رفتار ماند۔ مگر نشہ کے اُتار کے وقت صرف ڈپٹی مجسٹریٹ نظر آتی ہو

اور اس سے بھی نیچے اُتر کر تحصیلداری۔ غرض وہ ادیب یوں بن کر رہ گیا جیسے کسی ہوا باز کو "فورسڈ لینڈنگ" کرنا پڑے۔ اور وہ کسی بیگانہ سے جزیرے میں۔

بہرکیف فی الحال وہ ایک ادیب تھا۔ اس کا ایک نام بھی تھا اور اس کی ایک شکل صورت بھی تھی۔ مگر صورت شکل اور نام تو اس وقت منفرد شخص ہوتے ہیں۔ جب کوئی کامیاب حیات ہو جائے۔ اور وہ تو اس منزل کی مخالف جانب پھسلتا جا رہا تھا۔ وہ خلقت کے ہجوم میں ایک سپاٹ سا فرد تھا۔ لاکھوں لاکھ افراد کی طرح ایک فرد تھا۔ وہ زندگی کی چپٹی سطح پر ایک رینگتا ہوا ادیب تھا۔ محض ایک ادیب۔

وہ صبح سے شام تک رسالہ کے دفتر میں بیٹھا ہوا ادب کی چرخی چلاتا رہتا تھا۔ ۹ بجے صبح سے لیکر ۶ بجے شام تک، دوپہر کا کھانا وہ دفتر کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا کھا لیتا تھا۔ کسی چائے خانہ ورلنچل پھیری والے سے چند سوکھے ہوئے بسکٹ اور ایسی چائے جس کا رشتہ کتھے کے رقیق گھول سے زیادہ قریبی ہوتا وہ قہر درویش طور پر خرید لیا کرتا تھا۔ اور اب تو وہ ایسی چیزوں کو سالن کی سی یکسانیت کے ساتھ پی جاتا تھا۔ اس نے دفتر سے قریب کہنہ، فرسودہ شہر کی بوڑھی فصیلوں کے آغوش میں ایک معمولی سی کوٹھڑی کرایہ پر لے لی تھی۔ اس میں بھی شرکت تھی۔ دنیا میں کوئی چیز اس کی اپنی نہ تھی۔ گاؤں میں رہنے والے باپ ماں کی تنگ دستی و تنگ دامانی کے کسی گوشے میں اتنی ناممکن وسعت کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اسے اپنی خاص ایک دُنیا سمجھتا۔ وہاں بھی اس کے بھائی بہن شریک تھے۔ گاؤں کا مکان بھی جدی مکان تھا۔ اور یہاں امینی شہر میں اسے ایک چھوٹی سی تنگ کوٹھڑی میں بھی شرکت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اس کی اپنی ذات بھی تو اپنی نہ تھی۔ اس کے سارے اوقات، ساری مشغولیت پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رسالہ کا دفتر چھایا ہوا تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ وہ دُنیا کی کسی ہستی کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ڈبیوں کی دکان کا ایک ملازم دست فروش اس کے ساتھ رہتا تھا بس رات کے چند اندھے گھنٹوں اور صبح کی چند عاجلانہ ساعتوں کا شریک۔ وہ دونوں اس طرح ملتے تھے جیسے دو ماہانہ ٹکٹ رکھنے والے مسافر کسی ویٹنگ روم کو استعمال کرتے ہیں۔

اس کی چھوٹی کوٹھڑی میں سورج کی زریں کرنیں کبھی نہیں جھانکتی تھیں۔ پیاری پیاری نازک کرنیں اور رچی ہوئی سنہری دھوپ معمولی سی جھونپڑی میں بھی جان ڈال دیتی ہیں۔ ادیب کو اس بات کا احساس کہاں ہو سکتا تھا۔ مگر جب وہ سوکھے بسکٹ کھاتے کھاتے..... اور کام کے بوجھ سے دبتے دبتے بیمار پڑ جاتا تھا تو اسے کوٹھڑی میں دن بھر رہنا پڑتا۔ اس وقت اسے اس بات کا تلخ احساس ہوتا کہ اس کوٹھڑی میں فطرت کے ہلکے سے ہلکے تبسم کی بھی جگہ نہ تھی۔ وہاں اِدھر اُدھر گوریا، مینا، ابابیلیں کبھی آکر کھیلتی نہ تھیں۔ ننھی گوریا، پیاری مینا، چونچال ابابیلیں۔ ادیب کو اپنا گاؤں یاد آتا۔ اور اس کے درمیان سے دل میں ان پرندوں کے پیار کا درد سا اٹھتا۔ یہ پیارے گھریلو پرندے! اس کوٹھڑی کے اردگرد تو شوخ، شریر، باجی، اچکے، کائیں کائیں کرنے والے پرندے بھی نہ پھٹکتے تھے۔ پرانی وضع کی اونچی مکانات سے گھری ہوئی دکانوں کے کٹہروں کے عقب میں، گلی کے اندر، نچلی منزل کی ایک کوٹھڑی کاش وہاں ایک چوہا ہی ہوتا۔ مگر جب روٹی کا سوکھا ٹکڑا تک نہ ہو تو پھر غریب چوہا کیسے قسمت آزمائی کرے۔ بیماری میں ادیب اکثر فاقہ کرتا اور جب ذرا سکت ہوتی تو وہ اپنے اسی کھٹیا ہوٹل کا رخ کرتا۔ یا کسی پھیری والے دودھ فروش سے دودھ کا ایک کوزہ لے لیتا۔ وہ جب اچھا ہوتا تو اسی ہوٹل میں صبح کی چائے پیتا۔ اور رات کا کھانا کھاتا۔ رات کو وہ تھکا تھکا یا آکر پڑ کر بے چین سی نیند سو جاتا تھا اور خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ خواب دیکھا کرتا۔ جسمانی کام کی تھکن سے نیند تو اچھی آتی ہے۔ کم از کم مگر دماغی کام کے بوجھ سے اعصاب جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ اور نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا۔ اپنی گاؤں سے نکلتی ہوئی اسے ایک پگڈنڈی نظر آتی تھی۔ وہ پگڈنڈی سیدھی نازدان سے بڑھتی ہوئی اس عظیم الشان شہر تک چلی آتی تھی۔ یہ نازک مگر آرزومند پگڈنڈی پھیل کر، رچ اور سنور کو انارکلی بن گئی تھی کالج کی زندگی کی انارکلی البیلی، بھرپور اور شاداب امنگوں سے بھری ہوئی ارمانوں سے کھیلتی ہوئی۔ پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انارکلی جوان ہو کر مال کی ٹھنڈی سڑک بن جائے گی۔ مطلق نازاں سرشار، پھولتی پھلتی۔ گرم سیر۔ اور یہ مال وسیع ہوتے ہوتے سارا ہندوستان بن جائے گا۔ گونجتا ہوا ملک، پھر وہ اپنا سفر یاد کرتا۔ جب راوی اور گنگ وجمن کی وادیوں کو روندتا وہ سارے شمالی ہند کا دورہ کر رہا تھا۔ وہ ہر شہر میں فاتح کی طرح داخل ہوتا تھا۔ ہر شہر اسے اپنا معلوم ہوتا۔ اپنی ملکیت، سحر آگیں کلکتہ، باغ و بہار لکھنؤ خوبصورت آگرہ۔ شاندار دلی۔ یہ سارے کے سارے اس کے دل کے ایک گوشے میں آباد تھے۔

ادیب کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ رات کی چشم بیدار کے کاجل پر اس کے سفید آنسو ڈھلک کر ایک لمبی سی پگڈنڈی بنا دیتے۔ جو نہ انارکلی بن جاتی نہ ٹھنڈی سڑک۔ اسے دکھائی دیتا کہ اس کی تمناؤں کی انارکلی ایک بیدرد سے بھول بھلیاں میں اُلجھ کر گم ہو گئی۔ بہرکیف رات کٹ ہی جاتی اور صبح ہوتے ہی وہ اپنا دن دفتر کی بے کیفی میں گم کرنے کو روانہ ہو جاتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی طرح سے پانچ سال سے وہ زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ کو لا حاصل کاموں کی چٹان پر رسالہ کے آہنی دفتر میں جا کر دے مارتا تھا۔ شام کو ادیب پُر اذیت خلا میں الٹا لٹکا ہوا سا محسوس کرتا۔ دفتر کا ناقابل اختتام کام ختم کر کے خالی خالی وہ گلیوں اور بازاروں سے گذر کر اپنے مخصوص گھٹیا سے ہوٹل میں جاتا۔ اکتایا ہوا، بے یقین۔ بے مقصد۔ ہر شے اسے دھواں دھواں سی مبہم۔ غیر حقیقی اور بے معنی معلوم ہوتی۔ وہ زندگی کو چھو کر اپنی زندگی کا ٹھوس احساس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر سارا شہر، ساری کائنات اسے جادو سے بنی ہوئی محسوس ہوتی۔ دیواریں پگھلتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ مکانات محلول ہوتے ہوئے اور قدیم شہر کی بے محل فصیل بخارات میں تبدیل ہوتی ہوئی سی معلوم ہوتی۔ اسے نفی حیات سے سخت دُکھ پہنچتا۔ وہ بڑی بے تابی سے چاہنے لگتا کہ یہ بھری دُنیا قائم رہے۔ لیکن جو سماء میں یہ ناچیز کرۂ دخانی کی صورت اختیار کر کے تحلیل ہوتا جاتا۔ وہ اسے بچانا چاہتا مگر اس کے پھیلے ہوئے نامراد ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ جاتے۔ وہ تیزی سے سانس لے کر مٹتی ہوئی زندگی کی ایک ایک رمق کو اپنے اندر جمع کر لینا چاہتا تھا۔ اس کیفیت میں کبھی کبھی وہ دیر تک بازاروں اور گلیوں میں یونہی آوارہ پھرتا رہتا۔ اور جب یہ احساس دردناک حد تک بڑھ جاتا تو وہ اپنی کوٹھری میں واپس آجاتا۔ اس وقت اسے اپنی کوٹھڑی کی فرسودہ و مضمحل مگر جانی بوجھی اور محدود فضا زیادہ یقینی اور قابل اعتبار معلوم ہوتی۔ اسے اپنے ساتھی کے خراٹے بھی بھلے لگتے۔ زندگی کے ذرّے پر ایک قدم رکھ کر وہ مینار سے پھسل جانے کی پُر الم غیر یقینی کیفیت سے نجات پا جاتا تھا۔ بلندی سے گرتا ہوا انسان ماحول کی اشیاء کو بھی قلابازیاں کھاتے ہوئے اور ٹھوس حد بندیوں کو غیر واضح ہو کر بکھر جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ بھرے بازار اور رچی ہوئی

دنیا میں ادیب اسی نوع کے فریب نفل میں مبتلا ہو کر اذیت اٹھانے لگتا تھا۔ اور اپنی ہیچ سی، بے مایہ کوٹھڑی میں اس کے تصورات کو ٹھیک سی بل جاتی تھی۔ اور تقابلی طور پر سکون مل جاتا تھا لیکن پھر صبح ہوتے ہی یہ کوٹھڑی دوسرے مکانات کی دیواریں اور قدیم شہر کی بے مہر فصیل اس قدر مخالفے کے ساتھ ٹھوس، مستحکم، منجمد اور اٹل ہو جاتیں کہ وہ ان کے درمیان یوں محسوس کرتا کہ وہ ایک چنا ہے اور اوپر کا پاٹ بے چلے ہوئے اسے دبا کچلا جاتا ہے۔ وہ اپنی پسلی کی ہڈیاں کڑکتی ہوئی محسوس کرتا اور سر کی کھوپڑی تڑختی ہوئی۔

اسی طرح وہ کام کئے چلا جاتا تھا۔ چھ سال قبل کا خوش باش و دوست دار نوجوان اپنے احباب سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ہر وقت منجمد سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں یا شناساؤں کو اپنی کوٹھڑی یا رسالے کے دفتر میں لانا اپنی تضحیک سمجھتا۔ وہ اپنی پستی کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کا دوست دور دراز علاقے سے آیا۔ اس ملاقات سے اُسے سخت الجھن ہوئی۔ دفتر کی کوٹھڑی میں دونوں آمنے سامنے دیر تک بیٹھے رہے۔ کچھ یونہی سی رسمی اکھڑی اکھڑی باتیں ہوئیں۔ اس کی دور بیز آنکھوں سے آشکارا تھا کہ وہ اس وقت یہی محسوس کر رہا تھا گویا کوئی جیتے جی اس کی کھال ادھیڑ کر اس کی چیر پھاڑ پر تلا ہوا ہے۔ لیکن نگاہوں میں التجا تھی اور کرب کاش اس کا دوست نہ آیا ہوتا! ایک سال سے وہ اپنے گاؤں نہ گیا تھا۔ وہ تو اپنے کو مطلع کی مٹھی کے ایک پُرزے کی طرح بنا دینا چاہتا تھا۔ اتنا ہی بے احساس، اتنا ہی نا دیدہ۔ وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ کسی سے نہیں ملتا تھا۔

مگر آج رات کا خواب اس کے احساس کی چنگاریوں کو زندگی کی خاکستر سے کرید کر نکال رہا تھا۔ خود اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مبہم طور پر بے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چین ۔ بے کسی کام میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا ۔ آئے ہوئے مضامین کی اصلاح و ترتیب ہو رہی تھی ، نہ ادیبوں کو خط لکھے جا رہا تھا ۔ اس نے پیڈ اٹھایا ۔ ملک کے مشہور شاعروں اور افسانہ نگاروں کو خط لکھ کر مضامین اور نظموں کی استدعا کرنی تھی ۔ پر وہ ایک سطر بھی تو لکھ نہ پایا ۔ اسے غیر واضح ڈر سا محسوس ہو رہا تھا کہ مضمونِ خط میں کچھ بھونڈا پن رہ جائے گا ۔ بس سے اس بیگی ہو گئی ۔ وہ ٹی ۔ ایچ لارنس کے ایک افسانہ کا ترجمہ کرنے بیٹھا ۔ ایک دو جملوں کے بعد اس کی طبیعت کی نارسائی کھلنے لگی ۔ پھر اس نے ایک المیہ قلم لکھنے کی ٹھانی ۔ دو بند بڑی سرعت سے وہ لکھ گیا ۔ تیسرے بند پر موزونیت آکر جو اٹکی تو دس پندرہ منٹ کے بعد وحشت ہونے لگی ۔ اس نے ادب دب کو تہہ کر کے رکھ دیا اور لگا سالنامہ کے لیے اب تک کے خرچ کا حساب پڑتالنے ۔ مگر ہر دفعہ جوڑنے گھٹانے میں غلطی پر غلطی ہوتی جاتی اور بہت سے خرچ مدیں یاد نہیں آتی تھیں ۔ اس نے اکتا کر رجسٹر پٹک دیا اور مطبع میں لیتھو کے پتھروں کو دیکھنے چلا گیا ۔ کئی پتھروں پر الفاظ کھے جا چکے تھے ۔ ذمہ دار عملہ سے اس کی تو تو میں میں ہو گئی چڑچڑا کر وہ شڈ سے باہر گلی میں نکل آیا ۔ نکڑ پر ایک دس سالہ لڑکی تھی رہی تھی ۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا ۔ اس کے بھیگے ہوئے کپڑے جسم سے چپک چپک کر بدنما معلوم ہو رہے تھے ۔ اس حال میں اس کا دبلا پتلا جسم اور نحیف دکھائی دیتا تھا ۔ لڑکی کے پھٹے پھٹے جسم میں اسے ناگوار سی زبونی کا تلخ احساس ہوا ۔ وہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں کچھ کمی کا احساس پا رہا تھا ۔ وہ پھر دفتر کی کوٹھڑی کے اندر چلا گیا ۔ اب اس نے پروف دیکھنے شروع کئے ۔ اس میں کتابت کی اتنی غلطیاں تھیں کہ وہ سالنامہ کی طرف سے مایوس سا ہونے لگا ۔ اسے اپنے پر اعتبار نہ تھا کہ وہ اس قسم کے سارے اغلاط کی تصحیح کر سکے گا ۔ پریس کسی سینما کا اشتہار چھاپ رہا تھا ۔ اس کی سمع خراش گھڑگھڑاہٹ ادیب کے لیے

ناقابلِ برداشت ہونے لگی ۔ وہ آپ ہی آپ چڑچڑانے لگا ۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ یہاں سے ان ساری مشینوں کو توڑ پھوڑ کر بھاگ جائے ۔ اور بس بھاگتا چلا جائے ۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ اپنا پرانا گرم کوٹ پہن لیا ۔ اور پھر کرسی کا پشتہ پر کوٹ میز پر پڑے ہوئے اغلاط کو مبہم طور پر تکنے لگا ۔ رات کا سارا خواب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ پھر اس کے اندر عجیب سی بے چینی شروع ہوئی ۔ وہ مطبع کے دفتر سے باہر نکل آیا ۔ اور تیز قدم اٹھاتا ہوا پرانی فصیلوں کی تنگ آغوش سے باہر نکل آیا ۔ مہینوں کے بعد اس نے ایسا کیا تھا ۔ کئی ماہ ہوئے وہ کاغذ کی منظوری خریداری کے لیے اس حلقے سے باہر نکلا تھا آج اس کا جی چاہتا تھا کہ ساری ذمہ داریوں کو پھینک کر آزاد پھرا پھرے ۔ بغیر سوچے سمجھے اس کے دل میں بہت سی واضح غیر واضح خواہشیں پیدا ہوئیں ۔ اور بہت سی نفرتیں جاگ اٹھیں ۔ اس کی حیات کا بند سرچشمہ محبت و نفرت لیے ہوئے آج چھوٹ بہا تھا ۔ آج وہ شالامار جانا چاہتا تھا ۔ انارکلی کی سیر دل بھر کے کرنا چاہتا تھا ۔ ٹھنڈی سڑک پر آدھی رات تک سرگرم نظارہ رہنا چاہتا تھا ۔ اور پھر نہ جانے کیا کیا کرنے کا آرزومند تھا ۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کیا کیا ، پر ایسا لگتا تھا کہ اور بھی بہت کچھ کرنے کو ہے ۔

وہ باہر نکلنے سے عموماً اس لیے بھی گھبراتا تھا کہ اس شہر میں ہر جگہ ادیب و شاعر ہوتے تھے ۔ اور ان اخبار و شعراء کے درمیان افسانہ فرق مراتب اور تاجرانہ رقابت و ساز باز پائی جاتی تھی ۔ یہ بیچارے ادیب کے لیے بہت روح فرسا چیز تھی ۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں ان حضرات میں سے بزعم خود کوئی اونچا ادیب سر راہ نہ مل جائے ۔ مالی طور پر کامیاب ادبا و شعراء بڑی منزل والی ہستیوں کو بس ایک رینگتا ہوا کیڑا سمجھتے تھے ۔ کامیاب ادیب بننے کی اسے تمنا تو ضرور ہوتی رہی تھی ! مگر اپنے افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ کبھی اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا تھا ۔ ہاں وہ یہ ضرور سمجھتا تھا کہ اگر اسے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فضا سازگار مل جاتی تو وہ بہتوں سے آگے نکل جاتا۔ لیکن حالات نے رفتہ رفتہ اسے کچلا تھا کہ اب تو وہ اپنے کو بالکل بے وقعت سمجھنے لگا تھا۔ بے نام و نشان، نیم ادبی، و نیم تاجرانہ رسالوں کے دفتر کا حقیر سا ایک ملازم۔ وہ کبھی کبھی اپنا نام زیر لب لیتا۔ اسے دو ہراتا اور کئی بار اس کی تکرار کرتا۔ مگر نام کے کوئی معنی مرتب نہ ہونے کو مئی شخصیت ابھرتی نہیں۔ وہ تو گا ہے آئینہ دیکھنے سے بھی جھجکتا تھا۔ دوسرے ادبا سے ملنا ملانا تو اس کے لیے وبال جان ہوتا تھا۔ مگر آج اس کے دل میں تمناؤں کے ساتھ نفرت بھی جاگ اٹھی تھی وہ شہر کے شعرا، ادبا سے اتنی نفرت کر رہا تھا کہ وہ سارے کے سارے بے وجود ہو کر رہ گئے تھے۔ آج وہ ان کو استغنا کے ساتھ نظر انداز کرتا ہوا ان کے سامنے سے گذرنا چاہتا تھا۔

اس کے قدم آگے بڑھتے گئے اور وہ کشاں کشاں لارنس باغ جا نکلا۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ دوپہر کی ہلکی سنہری دھوپ لارنس کے درختوں سے اختلاط کر رہی تھی۔ اکا دکا لوگ باگ سیر کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ ادھر ادھر ٹولیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ یہ باغ اس کے لیے نیا نہ تھا۔ لیکن اس وقت اسے نیا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ہمدردی و وسعت "اس کی آبادی" اس کا سکون ادیب کے لیے نا آشنا سی مسرت پیدا کر رہے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چپہ چپہ پر لیٹ کر سبزۂ بیگانہ کو جو ابھی ابھی بیگانہ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی آغوش میں لے لے اور خود اس کی گود میں چلا جائے۔ وہ بلند و بالا درختوں سے لپٹ جانے کا آرزومند تھا۔ آخر وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس اقدام سے اسے ناقابل بیان سرور حاصل ہو رہا تھا۔ خاص سرور۔ ٹیلے کی مذکر صورت، اس کا بھرپور گداز اور دعوت کناں رفعت! اوپر جا کر ادیب لیٹ گیا اور نیلے آسمان میں اپنے تصورات، خیالات اور اپنی آرزوؤں کو گھولنے لگا۔ زمین کی کھلی آغوش اتنی پیاری معلوم ہوتی اور اتنی

محبت کناں کہ لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں درد الفت اور بہجت سپاس گذاری کے آنسو امڈ آتے۔ آسمان کی آزادی بخش روحانیت، اس منزہ مطہر فضا ادیب کی روح کو اپنی طرف بلند کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آسمان نیلا نہ ہوتا تو فطرت کی کتنی نامہربانی ہوتی۔ آسمان کی نیلاہٹ آج اس کے لیے نیا پیام تھی۔ وہ اپنے خواب کو اس کی گہرائیوں میں تحلیل کر کے پھیکا، بے اثر بچ کر چکا تھا۔ فی الحال وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کا ایک جز محسوس کر رہا تھا۔ اور ان کی عظمت، وسعت، رفعت اور محبت کا شریک رخصت ہوتا ہوا آفتاب رقص کناں پتوں پر آب زر چھڑک رہا تھا۔ جس کے چھینٹے ادیب پر بھی چھن چھن کر پھوار کی طرح گر رہے تھے۔ وہ ازلی و ابدی لذت و سرور میں گم تھا۔

ایک ریشمی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کی۔ ایک جوڑا ٹیلے کی خاموش تنہائیوں میں مخل ہوا تھا۔ ادیب کو انھیں دیکھ کر وقت کا احساس ہوا۔ اس نے نیلی ساٹن کی شلوار اور استرخانی اوور کوٹ کو عجیب بیگانہ نظر سے دیکھا۔ اور اس کے اندر ملفوف ہستی کے متعلق جاگتے خواب دیکھنے لگا۔ آنے والا جوڑا بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور مرد چڑھ چڑھ کر اپنی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ادیب کو تلخ بیگانگی کا احساس ہوا۔ اس نے پناہ کے لیے لڑکی کی آنکھوں کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ مگر وہاں اسے نمایاں بے توجہی اور دل شکن بعید سی فطرت کا سراغ ملا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ اور شاید فردوس گمشدہ آدم سے بھی زیادہ تلخ کیفیت میں مبتلا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر بے خبری کے عالم میں لارنس سے باہر نکل آیا۔ کھوکھلی سی روح فرسا کمی کی تلخیاں لیے ہوئے وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ بالکل غیر شعوری طور پر وہ ٹھنڈی سڑک سے بھی گذر گیا۔ اور اسے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ وہ زمان و مکان کے بے رنگ و نور خلا میں اڑا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل سینے میں نہیں اس کا دماغ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کھوپڑی کو خالی چھوڑ کر فنا ہو گیا۔ ساکن، ویرانی، لاانتہا، بے آسرا مجہول۔ راہ میں انارکلی بھی ملی۔ آباد پر رونق، رواں دواں، سرگرم، رنگین گویا خنداں انارکلی۔ مگر وہ گزرتا گیا۔

کون جانے وہ کہاں جاتا۔ مگر اسے لاہوری دروازہ پر شہر کا ایک اور ادیب مل گیا۔

"کہیے جناب سالنامے کب نکل رہے ہیں؟ مضامین کی آپ کے پاس کمی تو نہ ہوگی؟ کیوں؟"

وہ چونک پڑا۔ ٹھٹک گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے دفتر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر وہ قدیم شہر بے رحم فصیلوں، تنگ ظرف گلیوں، اور اندھے بہرے گونگے مکانات کے اندر اپنے کو دفن کرنے سے گھبرانے لگا۔ وہ پلٹ پڑا۔

وہ ایک بار پھر انارکلی میں تھا۔ شام جوان اور رسیلی ہو کر رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ برقی شمعیں جل چکی تھیں۔ دکانیں دلہنوں کی طرح سجی ہوئی تھیں جیسے کاجل حسین آنکھوں کو محشرستان بنا دیتا ہے۔ اسی طرح رات نے انارکلی کو جادو نگار بنا دیا تھا۔ زرین کلاہوں سے لپٹی ہوئی پگڑیاں، خوش وضع سوٹ، نئی قراش کے سویٹر، گلوبند، مفلر، چمکتے ہوئے جوتے، بہرائی ہوئی طرحدار گرگابیوں سے نازونیاز میں مشغول تھے۔ دکانیں اپنے نرالے لٹا رہی تھیں اور جیبیں جذبۂ عطا سے لوٹی پڑتی تھیں۔ گوری گردنیں فسانۂ بازوؤں کو حمائل ہونے کے لیے ٹیلا ہی تھیں۔ بالاؤ بلند سرو ناز و عوت نظارہ دے رہے تھے۔ جسموں کے مدوجزر سے جذبات اور تخیل میں نقرئی لہر نگ پیدا ہو رہی تھیں۔ دائرے اور خطوط، تشبیب و فراز، نور اور سائے، صورتیں اور خیال، خندہ ریزیاں اور مسکراہٹیں، گفتگو اور سرگوشیاں، حرکت و سکون سب مل کر زندگی کے تنوع کا ایک مجموعی احساس پیدا کر رہے تھے۔ تانگے اور

موٹریں، ریڑیوں کے نغمے اور ہوٹلوں سے آنیوالی اشتہا خیز خوشبوئیں، گیزہاب دامنوں کی عطر بیزیاں، خوبصورت ہمکتے ہوئے بچے اور ان کی گداز سینہ مائیں۔ جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں۔ اور مرد۔ چھلکتے ہوئے پیمانوں کی طرح کالج کے بالیدہ نوجوان اور شوخ چنچل اور تھرکتی ہوئی تیتریاں یہ ساری موجیں انارکلی کے ایک دھارے میں وصل ہو ہو کر غلطاں و رواں تھیں۔ زندگی کی گرم سانسوں سے سڑک اور دوکانوں کی فضا ایسی بوجھل ہو رہی تھی جیسے پربہار کی سہ پہر کو دامن چمن۔ ادیب مسحور ہو کر رہ گیا۔

وہ کپڑوں کی دوکان میں گیا اور سوٹ کے طرح طرح کے کپڑے نکلوائے ٹویڈ، سرج، ونسٹیڈ، گیبرڈین، فلالین، کشمیرے، استرخان، پشمینے۔ یہ سب چیزیں نکلوا کر اس نے اس طرح دیکھیں جیسے وہ بہت سی شیروانیاں بنوائے گا۔ بہت سے کوٹ اور ایک دوچسٹر اور اوورکوٹ۔ اس نے قمیص کے کپڑے ملاحظہ کیے۔ سوئیٹر کے نئے نئے ڈیزائن۔ بہت سنجیدگی سے پسند کرتا رہا۔ پھر وہ جوتے اور ٹوپیوں کی دکانوں میں باری باری گیا۔ اور جدید فیشن کی چیزیں دیکھیں بھالیں۔ پارچوں کی دکان میں اس نے کریم، پاؤڈر اسنو، سینٹ، پائنابے، ٹائیاں اور رومال۔ بٹنوں کے سٹ نکلوائے۔ اور ان سب کا اس طرح جائزہ لیتا رہا جیسے وہ الہ دین ہے۔ اور دنیا کے کسی جادوگر نے ایسے باغ میں پہنچا دیا ہے جہاں مرجان کی شاخیں، نیلم کے پتے، زبرجد کی کلیاں، لعل و یاقوت کے پھول پھل ہیں۔ اس پر ایک عجیب حال طاری تھا وہ اس سنجیدگی کے ساتھ دکان دکان پھر رہا تھا جیسے وہ ان چیزوں سے اپنا دامن کو بھر لے گا۔ مگر وہ ہر دکان سے یہ کہہ کر لوٹ آتا کہ یہ چیزیں پسند نہیں آئیں۔

ایک دکان پر اس کی توجہ اپنی طرف پھیر لی۔ وہ دوکان کا ایک نمائشی مجسمہ تھا۔ ایک عورت کا مجسمہ، اگرا سے سچ مچ کی خوبصورت ساڑھی پہنائی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گئی تھی۔

اس کی طبیعت میں گداز پیدا ہوا، دل میں درد اٹھا ہلکا، مگر قلب کی گہرائیوں میں پیوست، بیساختہ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس مجسمے سے لپٹ کر رونے لگے۔ وہ اس مجسمہ کو پہچان سا رہا تھا۔ جیسے وہ ایک بچھڑی ہوئی عزیز ہستی سے سرِراہ زمانے کے بعد ملا ہو۔ ادیب کے دل میں اچانک ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ انارکلی کی ساری چیزیں اس حقیقی مگر موہوم وجود کے قدموں پر لاکر ڈال دینا چاہتا تھا۔ اسی جذبہ کے ماتحت اس نے پھر دکانوں میں ساڑھیاں بلاؤز کے کپڑے، گرگابیاں اور زنانہ سوئٹر دیکھنے شروع کئے۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے ساڑھیاں، بلاؤز، گرگابیاں گھر میں کافی ہوں۔ اور فی الحال ضرورت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم سوئٹر کوٹ ہو۔ اس نے دس بارہ ڈیزائن دیکھنے کے بعد ایک سرمئی رنگ کا فرداری زنانہ سوئیٹر کوٹ پسند کر لیا۔ دکان دار سے مول جول بھی ہوا۔ بات طے ہوگئی۔ پیکٹ بند ہوگیا۔ اور اسے خرید لینے کی لذت بھی حاصل ہونے لگی۔ قیمت ادا کرنے کے لیے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس نکالا۔ اسے کھولا۔ اس کے اندر صرف چند آنے پیسے تھے اسے خود بھی جیسے تعجب سا ہوا "اچھا! اوہو! بڑی غلطی ہوئی میں کافی روپیہ ساتھ نہیں لایا۔" اس نے بغیر جھجک، بلا حجاب دکان دار سے معذرت کی۔

"کوئی حرج نہیں۔ آپ کی پسند کی ہوئی چیز ایسے ہی رہنے دیتا ہوں آکر لے جائیے گا۔" دکان دار نے جواب دیا۔

"بس، اسی پیکٹ میں۔ میں ابھی آیا۔"

وہ دکان سے باہر چلا آیا۔ اس گویا سوچا کہ ایک کام رہ گیا ہے اسے کرتا ہی چلے کھلونوں کی دکان پہ جا کے اس نے تین آنہ کی ایک گڑیا لی۔ اور دو آنے کا ایک باجہ۔ وہاں سے سیدھا اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

جیسے واپس آکر اسے فوراً سوئیٹر کوٹ لے جانا ہے۔ کوٹھڑی کے دروازہ پر اسے رسالوں کے دفتر کا ایک کاتب ملا۔ کہنے لگا،

"آپ کی تلاش ہو رہی تھی جی۔ پتہ نہیں آپ کہاں چلے گئے تھے؟ مولوی صاحب ناراض ہو رہے تھے۔ کئی آدمی آئے آپ کو ڈھونڈھنے۔"

ادیب کو ایسے معلوم ہوا جیسے اچانک وہ دوسری دنیا میں آگیا جو بیحد جانی بوجھی ہوئی اور قاتل ہو جانے تک گلوگیر تھی۔ اسے اتھاہ ڈبو دینے والی تکلیف کا احساس ہوا۔

وہ دفتر نہیں گیا۔ بلکہ کوٹ پہنے ہوئے بستر پر اس طرح دھم سے گر کر لیٹ گیا ——

اس نے سوئٹر خرید لیا تھا۔ اسے لیکر وہ گھر واپس لوٹا۔ وہ جانی پہچانی ہوئی عزیز ہستی جو اب اس کی رونقِ کاشانہ ہو چکی تھی۔ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ بہت سے گلے شکوے ہوئے۔ اور بہت سی پیار کی باتیں سوئٹر جدید وضع کا سرمئی سوئٹر اور اس پر سیاہ فر۔ اس عزیز ہستی نے سوئٹر پہن لیا۔ گوری گوری گردن پر سیاہ فر۔ جیسے رات کی آغوش میں چاندنی مچل رہی ہو۔ وہ کتنی حسین کتنی وفا شعار، کتنی محبت کناں، تھی۔ ادیب کی دنیا کیسی کامراں، کیسی خوش آئندہ، کیسی شاداب تھی۔ اس نے اپنی نازش حیات کو گلے لگا لیا جیسے وہ بالکل بھول گیا تھا اچانک اپنی جیب سے اس نے کھلونے نکالے اور اپنے بچے کے لیے بھی تحفہ دینے لگا۔ اسے اپنے بچے کا کتنا خیال تھا۔ پیارا سا ہمکتا ہوا بچہ، پر بچہ سامنے نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بچہ بھی سامنے ہوتا۔ اور ماں بچے کو گڑیا لے کر ہنستے کھیلتے تو اور زیادہ خوش ہو جاتی۔ مگر جب وہ اپنی سرمایہ زندگی کو بچے کے کھلونے دینے لگا۔ تو وہ رنجیدہ ہو کر ہٹ گئی۔ مغموم، دل شکستہ، دردناک اور سرد آہیں بھرنے لگی۔ اس نے نہایت ہی اداس لہجے میں کہا ——

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"بچہ! مجھے بچہ کہاں؟"

اب وہ جانی پہچانی ہوئی عزیز ہستی مجسمہ بن گئی۔ بالکل مجسمہ، ساکت، بے حس، بے جان!

ادیب بے تاب ہوگیا۔ اتنا بے تاب کہ اس کی نیند اچٹ گئی۔ وہ بیدار ہوگیا۔ اس پر اذیت، تلخ اذیت کا احساس طاری تھا۔ کوٹھڑی میں اس کا ساتھی خراٹے لے رہا تھا اور وہ کوٹ کی جیب سے کھلونے نکال کر گڑیا کی ٹانگ اور ہاتھ اکھیڑ رہا تھا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔

اس نے پھر یہ دوسرا خواب دیکھا تھا۔

اختر حسین رائیپوری

مجھے جانے دو

"مجھے جانے دو" اس نے کہا۔ اور جب تک میں اسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھپک اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گذرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پایا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستیں بنیان پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو پھانسنے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے مصنوعی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر رواں تھرتھرا کر کہہ رہا تھا ——

ہمیں لے لو —— ایک روپیہ کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھونک دیتی تھیں۔ اور کوئی منچلی کسی بدنما ڈرائیور کے جوتے پر پان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھل کھلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبان حال سے کہتی تھی ـــــ ہمیں لے لو ـــــ ایک روپیہ کے بدلے۔

ٹرام پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گذرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت، نسوانیت کی کلنگ۔ خدا غارت کرے۔ چند ٹکوں کے لیے، شراب کی بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہے ـــــ اور ہم؟ ـــــ پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنھوں نے انھیں اونچی حویلی ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔ شام جب آرتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتی تو مٹی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے۔ اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی جو لوگ درشن کے لیے آتے، وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بیباکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے۔ جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا احساس مطلق نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اطمینان سے آرتی کا تماشہ دیکھتی۔ اور وقتاً فوقتاً کیرتن کے لیے پر پیروں سے ٹھیک دینے لگتی۔

جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بیتال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پنواڑی کو پکار کر کہتی ـــــ "ارے ذرا سی سُرتی تو بنانا۔"

اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا۔ اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی ـــــ "ارے اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے ـــــ؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر سے گذرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم جھولیوں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی، خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آجاتیں۔ دور ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا حتیٰ کہ پیر شل ہو جاتے تھے۔ میں یونہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ اندر سے شریف اس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوئے ٹیکسیوں میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں اوباش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پنجے دبائے بھاگتے نکل آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے کیوں کر ہم کلام ہونے کی جرات کی تھی۔

محمد یونس بیگ
مکان نمبر 50، بلاک نمبر 15، گلشن اقبال، کراچی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں ٹلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان سماج کی قبر میں چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اس نے مرتے مرتے کہا "میری پیپ تمہارے جسم کو سڑائے گی، میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔"

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایک خلا جس میں کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔

شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے، وہاں سے ایک اڈھا خرید لاؤ۔"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا برا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے۔ جیسے بھینس کے تھن سے دودھ ٹپک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے اندر مستوائے مل کر گا رہے تھے۔

"ایکا نمبروں کا آآآآ... بہا آآآ... بڑے نالا..."

میں نے جلدی سے ایک اڈھا خریدا۔ اور دوائی کی چاٹ چٹپٹی مسالے دار۔

اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا۔ اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر لوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں دو تین ستارے چمیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا مدعا زبان سے بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے۔ اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے، جب عورت خود اس سے پوچھے گی، تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اتار لی سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر باہر دیکھنے لگی۔ میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں

پھر وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل غازہ اور لاکھے کو دھو ڈالوں تو کیا رہ جائے ——— دھندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہوں۔ مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہوگی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے!"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں؟ یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے۔ مرد ——— سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ!

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس۔ تو تم آتے ہی اسے توڑ دیتے۔ یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو درندوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر آتے ہیں ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے پلوں میں دو چار کلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھر والی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لیے روٹیاں اور سلگار کے لیے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اجالے میں جب تم لوگ ادھر آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔ ان ٹکیتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں۔ انہیں شہر سے نکال دینا چاہیے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو۔ اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ اپنا تم منہ کالا کر کے اپنی حرام کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو۔ اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے؟"

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے در و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مرجاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم جا کر ان کے مولانا نورالاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں، اور تمہیں شرافت کی قسم کہ وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے نکل کر کہنا۔ مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق دل بور نہ ہوں۔

اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے، تو تم کہنا۔ میں آپ کی بیٹی کے جنازہ کا تماشہ دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے ایک مردِ مومن نے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اس طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپ کے ہم جنسوں نے تحفہ میں اسے گھناؤنی بیماریاں دیں۔ اور جب وہ مرگئی تو آپ کے حافظ نے اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ جب تم یہ کہہ چکو گے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے۔ لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا!

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی تھی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیچھے رو رہی ہے؟ تم لوگ جانوروں رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ——— مگر عورت! آہ عورت پر ظلم کیوں کرتے ہو۔

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ کرتی ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجدان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہم انھیں زنا بالجبر، اغوا، اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! ——— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا اگر اس کی جنت میں حوروں کے لیے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا

اب ہوا چل رہی تھی۔ اور تاڑ کے پتے غم ناک آواز میں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ دور کے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی "میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے۔ اور اب اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایۂ حیات اسے سونپ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے وہ پلیگ میں مر گیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش وہ ہماری محبت کو اخلاق کی مہر مل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا۔ اور وہ پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں جب ماں کے آگے اس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو اور جس عورت کے آگے اس کے محبوب کا جنازہ، اسے تسلی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو؛ میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر بیہوش ہو گئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہے۔

الہ آباد..... میرے نسبتی خالو کا مکان..... میری مرضی کے خلاف عصمت دری..... بدنامی کا ڈر..... کلکتہ..... یہ چکلہ

زیر اب وہ ٹوٹے پھوٹے جملے دوہراتی رہی اور چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی "کیا تم جا رہے ہو؟" اس نے اداسی سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا تو جاؤ خدا حافظ۔ اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا اور یہ اس کے بچوں کو ورثہ میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکہ داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔

مگر کبھی کبھی آکر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ دیر نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں، ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لیے چلے جاؤ۔"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر میں گرفتار نظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میرا نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یونہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" اس نے کہا ——— اور وہ چلی گئی۔

چودھری محمد علی

تیسری جنس

مدی کا اصلی نام احمدی خانم تھا۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں تو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کی مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر ہماری سے قطع نظر کیجیے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کھل گیا دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ ہونٹ کی شرم، نہ لبھاؤ ٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لیے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز مہین۔ چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی، میں مدی سے بہت بے تکلف تھا مگر عشاق میں کبھی نہ تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے۔ ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوشِ حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جائیے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی۔ جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم

اپنے بوڑھ والوگ اس کو مردہی سے منسوب کرتے ہیں یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان ہوتا تھا۔ اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے۔ تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجئے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات۔ کچھ خاص خاص کمزوریاں بھی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے۔ مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حقدار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ دو تھان رادھا نگری ڈوریے کے لیے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی یہ ڈوریہ کیسا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لیے۔ ڈوریہ وضعدار ہے، سلنے پر اور کھلے گا۔"

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لیے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

"خیر بھئی!"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں "میاں حسن علی آجکل بازار میں مچھلی نہیں آتی؟"

آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے صبح کو مرغ بگ جاتے گا" تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے۔ اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھبو داڑھی پر چھدری ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے لوگ کوئی نہ کوئی فی نکالیں گے۔

بہر حال اہلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے وہ یہ تھا کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہان میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلو تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے د کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی

تھی کہ جب کھانا کھاتے۔ تو حسن علی کی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے۔ کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحبِ اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا۔ دسترخوان پر شوربا گرانا۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پورا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے یہی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا۔ کھانا پکوانا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب رنگ اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھیں تو آئینے کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انھوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں لیجئے صاحب شادی ہوگئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولھا بھی تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھیں۔ گنیں بھی تو کھڑی سواری۔ بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آگئیں سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہونے کی پالی ہوئی تھیں۔ عمر بھر امیری کا رخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوار پنے کی آب نہیں رہ جاتی تو شہاگ کی توفیق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی ہیچ مرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا اس لیے چپ تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر اُدھر دیکھا۔ دلائی جھاڑی۔ پائینتی جھک کے دیکھا۔ گھر میں ادھر اُدھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہوگئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی۔ انھوں نے سنتے ہی

کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولھا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجئے صاحب شوہر ہی روٹھ گئے دو چار کے دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک دو زمدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا۔ اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرامزادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہوگئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا۔ داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پن ہی کر بیٹھے اس لیے مدی کا ہونے طور سے تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لیے معطل کر دیئے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہوگئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہوگئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے۔ مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لیے علیحدہ گھر اور کچھ بودگی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہوگیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی اولاد نہیں تھا یا بیکارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہوگئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ بی مدی نے سنبھالا ہی پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انھوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون

مسز وقار لائبریری
50 نمبر 15 بلاک نمبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں واب صرف بی مدی ا ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا بُرا کیا ہوگا اس کی ذمہ داری ص ان کے اوپر نہ تھی کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم د تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اسکے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھیں کسی کو اگر روپئے دو روپئے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیئے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانا نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آتے۔ روٹی اپنی پکاتے دال بی مدی کی ہانڈی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پان سے کھاتے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کیلیں لیں، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوتی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ سلسلہ

آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی برگت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی باتیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بیس بائیس برس کے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے نسبتہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چکلی ہڈیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرتا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہوگی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں یہ چیزیں فطری ہیں۔ اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا۔ مگر دعائیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنے ہی جنس سے تعلق اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضہ سے ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنیے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی اس کے بعد لڑائی ہوگئی کس بات پر بگاڑ ہوگیا یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ عورت جس راہ آئی تھی اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی پجڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جو ئندہ پا بندہ، تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر ؎

نہ بیوفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کہوں آغاز آشنائی ... کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا اسی لیے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامنگیر ہوئی۔ بی مدی نے تھیلے کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر

ہوگئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کیے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضرورت کا بساط خانہ بھی منگوا لیا چکن کروشیا کا بھی ڈھیر ڈالا۔ بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقے کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لیے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا "بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے" بی مدی بول اٹھیں "سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنھوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے ہمیشہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کرینگے۔ جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی بچائی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھہرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلیغم باغور تھے۔ جی چاہے انگنی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کنی گھنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

دیوندر ستیارتھی

گنگ پوش

اور سب پھول بہار میں کھلتے ہیں۔ مگر کیسر خزاں میں کھلتا ہے۔ وہ نہالی ابابیل جو ابھی ابھی اس ٹیلے سے پنکھ پھیلا کر اڑ گئی۔ شاید کیسر کے پھولوں کو بھر کے دیکھنے کے لیے ادھر آ بیٹھی تھی۔ کیا دھرتی کبھی اتنی بانجھ ہو جائے گی کہ کیسر اگنا بند ہو جائے۔

کتنی پھبن پھل ہے یہاں۔ یہ لڑکیاں ہیں یا رنگوں کی پریاں؟ کیسر کے پھول چن رہی ہیں۔ ان کے اعضا کا تناسب دیکھتا ہوں تو اس بت تراش کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے گوشت میں پتھر کی سی لوچ پیدا کی۔

رنگ کی ان لہروں میں میرا دل، جو پہلے امیرا کدل پل کے نیچے سے گذرنے والا خاموش اور بے رنگ جہلم تھا، اب اچھلنے لگا ہے کیا کشمیر کی سب ہی عورتیں ایک سی خوبصورت ہیں۔ نہیں تو۔ نہ سبھی ایک سی ناک ہے ایک سی لطیف اور نہ بدماتی ہیں۔ رنگ الگ بات ہے۔ روپ الگ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ٹھیکیدار للکار رہا ہے "جلدی ہاتھ ہلاؤ جلدی"

لڑکیاں خوشی خوشی پھول چن رہی ہیں۔ پہلے ٹھیکیدار کی کوک سن کر سہم جاتی ہیں۔ لیکن پھر باتوں کا وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے ماضی، حال اور مستقبل کا سارا تحیّن اس کھیت میں جمع ہو گیا ہے۔ یہ گوری گوری اگر دنیں۔ کالی کالی آنکھیں۔ کالی بدلیوں سی جن میں بجلی چمکتی رہی ہو۔ ہونٹ کانگ کے شہد سے کہیں زیادہ رسیلے اور چمکیلے۔ باتیں کرتی ہیں تو ہونٹوں کے کونے ہلتے ہیں اور میرے دل پر رنگین پھوار پڑتی ہے۔

چند بوڑھی عورتیں بھی پھول چن رہی ہیں۔ سال بہ سال کیسر چنتے چنتے ان کی جوانی بیت گئی۔ جب وہ دلہنیں بنی ادھر آنکلی تھیں تب بھی یہ کھیت اسی طرح کیسر پیدا کرتے تھے۔

وہ سُرخ پھرن والی نوجوان عورت، جو کسی بچے کی ماں بننے والی ہے پھول چنتے چنتے تھک جاتی ہے۔ جیسے لالہ کی ٹہنی بارش کے بوجھ سے جھک جائے۔

میری نگاہ گھوم پھر کر اس بن بیاہی الھڑ لڑکی پر آ ٹھہرتی ہے جس نے سبز اودی پھرن پہن رکھی ہے اس کی نرگسی آنکھوں میں حیا ہے اجھجک ہے اور کچھ کچھ ڈر بھی۔ اس کے چہرے پر بچپنے کی شریر لالی سنجیدگی کی طرف پہلا قدم اٹھا رہی ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ دیکھنے میں تو کچھ برائی نہیں اور اگر اس میں کچھ برائی ہے تو میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کشمیری سے کسی اجنبی کی طرف دیکھنا جھکا لینا کیا کم بے انصافی ہے۔ اس کے بازوؤں کی تراش دیکھوں یا اس کی پتلی پتلی انگلیاں!

ٹھیکیدار کے بول ڈانٹ رہے ہیں جھڑک رہے ہیں۔ اور جب وہ لال پیلا ہو کر کہہ اٹھتا ہے "او، پھرتی سے ——— اور پھرتی سے ———" تو ہر ایک کا چہرہ پیلا پھر جاتا ہے، بوڑھی عورتوں کا بھی۔

پھولوں کی پتیاں بنفشی رنگ کی ہیں۔ ہر ایک پھول میں چھ چھ رنگ ہیں تین زرد اور تین نارنجی۔ پھول چننے کے بعد انھیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالی دیا جائے گا۔ اور پھر نارنجی تار، جو اصل کیسر ہے، الگ کیے جائیں گے زرد تار پھینک دیے جائیں۔ مگر یا تو وہ یونہی کیسر میں مل جائیں گے، یا جان بوجھ کر اس کا وزن بڑھانے کے لیے ملا دیے جائیں گے۔

پچھلے ہفتے جب میں اپنی بیوی اور بیٹی سمیت چاندنی رات میں کیسر کے پھول دیکھنے آیا تھا۔ کیسر کے تار سونے کی طرح چمک رہے تھے کبھی میں اوپر آسمان پر تاروں کو دیکھتا رہا اور کبھی کیسر کے تاروں کو۔

میرے ذہن میں ایک خوبصورت تصویر بن گئی ہے۔ اس سبز پھرن والی الھڑ لڑکی نے پھر ایک بار میری طرف دیکھ لیا ہے۔

سات سال پہلے بھی میں کشمیر آیا تھا۔ جو تصویر اس وقت میرے ذہن میں خود بخود بن گئی تھی وہ بھی تو قائم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں کیسر کا کھیت موجود نہیں۔ اور یہ کمی اس وقت پوری ہو رہی ہے ——

کیسر چنتی چنتی کنواریاں ایکا ایکی ایک گیت مل کر گانے لگی ہیں، جسے سن کر ٹھیکیدار کے گلے میں بھی سُر خرخرانے لگے ہیں۔

یار گئے پامپور وتے
کنگ پوش ورٹ نال متے
سوہنے تے بھیس پتے
یار ملیا ہیو بوتم زار!

میرا محبوب پامپور کی طرف چلا گیا! (اور وہاں) کیسر کے پھول اس سے ہم آغوش ہو گئے۔ (آہ، وہ وہاں ہے اور میں یہاں۔ اوخدا! میری آرزو

لہ کشمیری عورت کی پوشش۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سن۔

وہ سبز پیرن والی شرمیلی لڑکی بڑی ہو کر شاید اس گیت میں اپنی زندگی کا کوئی تلخ تجربہ یا ہوا رنگ اپنانے کی کوشش کرے گی۔

یہ اونچی نیچی زمین ہے کچھ جہلم کے کنارے کنارے اور کچھ دور ہٹتی چلی گئی ہے۔ کتنے ہی چھوٹے چھوٹے الگ تھلگ ٹیلے سے نظر آ رہے ہیں۔

میں ٹھیکیدار سے پوچھتا ہوں "ان ٹیلوں کو ادھر کیا کہتے ہیں؟"

وہ جواب دیتا ہے "وڈر یا کریو!"

ٹھیکیدار کا چہرہ جس پر گہری جھریاں نظر آ رہی تھیں، اور بھی سنجیدہ ہو گیا ہے۔ گویا وہ بھی ایک ضروری آدمی ہے اور جیسے اس سوال کا جواب وہی دے سکتا ہے۔

اس نے مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا ہے۔ وہ مجھے بتا رہا ہے کہ یہ وڈر یا کریو سب کے سب بارانی زمین کے ٹکڑے ہیں۔ مگر ہیں بڑے زرخیز۔

"تو کیا ان سبھی وڈروں میں کیسر پیدا ہوتا ہے؟"

"نہیں تو، کیسر تو پانچ کے وڈروں ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس بارہ ہزار بیگہ زمین پر خدا کا بڑا فضل ہے..... یہاں مٹی کیسر پیدا کرتی ہے۔"

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ زمین مہاراجہ کی ذاتی ملکیت ہے۔ اور جو بھی اسے ٹھیکہ پر لیتا ہے اس کا آدھا کیسر اپنے ماتحت کھیتی کرنے والوں میں بانٹ دیتا ہے اور آدھا خود لے لیتا ہے جس میں سے اسے ٹھیکہ کا روپیہ چکانا ہوتا ہے۔

"آدھی چھٹانک کیسر تیار کرنے کے لیے چار ہزار تین سو بار پھول چنے جاتے ہیں۔" وہ بڑے فخر سے کہہ رہا ہے جیسے اس کے باپ دادا ہمیشہ کیسر کا ٹھیکہ لیتے رہے ہیں۔ اور اس کی جہاں دیدہ آنکھیں، جن میں کچھ خود بینی بھی جھلکتی ہے مست ہوا لگتی ہیں۔ جیسے اس نے کیسر کا یہ راز مجھے بتا کر کبھی نہ کبھی کیسر کا ٹھیکہ لینے کے لیے اکسا دیا ہے۔

کیسر سے مجھے پیار ہو گیا ہے۔ میں اسے سب جگہ دیکھنا چاہتا ہوں ہندوستان کے نقشے پر میں ہر جگہ کیسر چھڑک دینا چاہتا ہوں۔

"مبارک ہے وہ دھرتی جہاں کیسر نے جنم لیا ہے!" یہ کہتے ہوئے کل ایک دوکاندار نے میرے لیے پانچ روپے کا کیسر تول دیا تھا جیب سے روپے نکالتا ہوا سوچ رہا تھا کہ کون جانے میری نگر کے اس دوکان دار کی بیوی کا نام کیسر ہو۔ اور وہ رات کو گھر آ کر اس کے سامنے بھی کہہ اٹھے

"مبارک ہے وہ دھرتی جہاں کیسر نے جنم لیا" اور وہ عورت یہ سمجھے کہ اس کے حسن کی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے خاوند نے ایک خانہ بدوش ادیب کے پاس تھوڑا کیسر بیچ کر ایک آدھ روپیہ کمایا ہے۔

میرے ذہن کی ساری شعریت سمٹ سمٹا کر کیسر کے اردگرد گھومنے لگی ہے۔ میری بیوی نے کیسری ساری پہن رکھی ہے۔ ہاں ہاں، بچا دیکھو میری بیٹی نے بھی کیسری فراک پہن لیا ہے اور میں خوش ہوں۔

کاش اس شرمیلی لڑکی نے کیسر کے کھیت میں کیسری چادر اوڑھا ہوتا تب اس کا گورا رنگ ایک سنہری جھلک لے اٹھتا وہ بچی اور بھی سندر دکھائی دیتی۔ اور میں سوچتا تھا وہ کیسر کے کھیت کی بیٹی ہے..... ہر کیسر کی بیٹی ہے

شام کی کیسری بشاشت دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس نے میرے دل کی زبان کو سمجھ لیا ہے۔ یہ یہ رنگ تو اسے ہمیشہ سے پیارا ہے۔ نت نئے میں کھو رہی اشاکے چاؤ۔ اور وہ سب رنگین جذبات جو ہمیشہ سے شاعروں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میرا بہترین افسانہ

ناز لائبریری
اقصال بلاک کیٹ نیزد کے ایم سی مارکیٹ
B/6 کمرشیل ایریا ناظم آباد نمبر 2 کراچی

سرور لائبریری
50 مکان نمبر 15 بلاک نمبر

مرتبہ

محمد حسن عسکری

Scanning Project 2015

Book No.58

Donated By:
Dr. Moin uddin Aqeel

Special Courtesy :
Salman Siddqui

.

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ ان میں کس مدرسۂ فکر کی پیروی کی گئی ہے، نہ اُن سے کوئی سبق اخذ کرنے کی کوشش کیجئے۔ ان کی اداس وَدَر کی اضافی قدر و قیمت کچھ ہوا کرے، آپ صرف ایک بات پر غور کیجئے۔ کیا یہ آرٹ ہے؟ کیا یہاں زندگی ایسی ٹھوس شکل میں پیش کی گئی ہے کہ جہاں وہ اصل سے سوگنا زیادہ باترتیب، زندہ، حساس اور پر معنی ہے؟ کیا یہاں بے نام چیزوں کو نام مل گیا ہے؟ کیا یہاں زندگی کے خام مواد سے ایسی صورتیں تخلیق کی گئی ہیں جو جیتے جاگتے انسانوں سے بھی زیادہ حقیقی ہیں — بقا کی پروردہ؟ کیا یہ افسانہ ہماری رگوں میں ایسے آگ آیا ہے جیسے زرخیز مٹی میں پودا؟

اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوس نہیں ہونا پڑے گا۔

محمد حسن عسکری

۳۰۔ جون ۱۹۴۳ء

فاز لائبریری
الطحال سائز کمپلیکس کے سامنے سائز کمپلیکس
B/6 کمرشیل ایریا نائلم آباد نمبر 2 کراچی

جملہ حقوق بحق ساقی بکڈپو دہلی محفوظ

(مطبوعہ محبوب المطابع۔ دہلی)

طبع دوئم

قیمت عہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اوپندر ناتھ اشک

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا، اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے

سردیوں کے مختصر سے دن کو گزرے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا سا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی سی بنیان، اس پر جھوٹا گرم انڈرویر، اس پر موٹے کھدر کی قمیص، اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست، دسمبر کی تیکھی، ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا۔ تو وہاں میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لاکر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی! میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام کے ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟"

"میرے پاس کپڑا ہے بابوجی!"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی مٹی کے تیل کا گرم تیز بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔" وہ کہا کرتے ہیں۔ "اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے ——— اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے میں بارہا محسوس بھی کرتا ہوں۔ لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے۔ میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو میں اٹھ کر پھر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے، کچھ اس طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے گرد لپیٹ میں کام پر آ بیٹھتا

بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برابر برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا۔ اور "کمیونٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ بینگن کا پودا دو بار پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا سکڑا پچکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا پڑی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی لیکن وہ بے حد ضعیف دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ، پالس کی ٹانگیں، سوکھا چہرہ اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ——— بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہاگنا بھی چھانٹے پر بڑھتا ہے۔ دنیا میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹے پر پہلے سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ تو پھر انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا۔ انسان کی بیل بھی تو اُمر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد عورتیں، بچے، بوڑھے اس کے پھل پھول اور شاخیں جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انھیں کاٹ دیتی ہے۔ اور ان کی جگہ نئے ہرے بھرے زندگی سے بھرپور اچھلتے، کودتے ناچتے گاتے پھول اور پتے لگتے ہیں اور زندگی کی امر بیل بڑھتی ہوئی پھولتی پھلتی جھومتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں آ پڑا ہے۔ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا تھا "ارے بھئی تم ہو کون؟"

"میں جی۔ ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

بوڑھا کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا

فار لائبریری
اقبال مارکیٹ نزد کے ایم سی مارکیٹ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کو، رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور بیوی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں ـــــ بیاہنے کے قابل ـــــ اور وہ روزگار کے لیے ماہی رام کے ساتھ آگیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لیے ناممکن ہوگیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں۔ اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پر شاید ایک میلی پھٹی دلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے ـــــ قریب قریب چگل کر میں نے کہا "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے! برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو؟"

لیکن اس وقت سمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے ماہی رام ـــــ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازہ پر آکھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی۔ اس کے نیچے کالا موٹا کمبل گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتہ۔ ایک دن چھ مولیوں کے لیے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا۔ اور اسے پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابوجی" ماہی رام نے کہا "نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو دن دیکھتے ہو گئے ہیں۔ ایک رات گوبھی کے دس پھول غائب تھے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکے ہوئے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچھ کو بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر دو سو روپیہ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ سب بھی تو اسی میں سے پورا کرنا ہے۔ اور پھر مزدوروں کی مزدوری"....

"لیکن ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے" میں نے کہا "یہاں تو کبھی

چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی بھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں"

"نہیں بابوجی باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آسکتا"

"لیکن اس دن مولیاں....."

"وہ اور بات تھی بابوجی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔ جاتے جاتے اکھاڑ کرنے گیا۔ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر کو کان ہو جائیں" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر اسے چاہو تو اندر سلا دو"

"نہیں بابوجی سردی تو امیروں کو لگتی۔ اسے تو بونہی محض دکھاوے کے لیے یہاں سلا دیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا ـــــ ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے کوئی آیا کہ میں نے اسے دبوچا" اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے؟....."

"کافی ہیں بابوجی"

اور یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن کام مجھ سے ہو نہ سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس ـــــ دھن، دولت اولاد اور بے فکری کی وجہ سے اس کے گال اس پچاس برس کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے ـــــ اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گرم اپنے کمرے میں مزے سے لیمپ ہانک رہا ہوگا، تاش اور شطرنج میں مشغول ہوگا۔

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا۔ اور کمرہ خوب گرم تھا ـــــ میں اٹھا کچھ ضروری کاغذ اور قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل سویرے ذرا جلدی اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے میں تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن "نہیں نہیں بابو جی میرے پاس کافی کپڑے ہیں" اس کا یہ جواب سن کر میں قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر میں نے کمبل ڈالیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لیے۔ اور پھر انھیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے ـــــ بے ربط بے ترتیب۔ لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہوگئیں اور پھر بند۔

سوتے سوتے کبھی ماہی رام، کبھی اس بوڑھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا۔ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے۔ اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں تک لے گیا ہے۔ سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے چور نہایت درد بھری نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ چور ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں۔ ذہی گھٹا ہوا سر وہی پھولے ہوئے گال اور چپٹی ناک۔

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی ہے۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ بھاری ہے اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

میں نے سرہانے رکھے لوٹے سے پانی پیا۔ اور پھر لحاف کو اچھی طرح سے اوڑھ کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ شاں شاں ـــــ شاں شاں ـــــ اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے۔ پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑ رہے ہیں۔ کیاریوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ صرف اسی مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی ہو گئی۔ گھٹنوں کو پاؤں میں لیکر سینے سے لگائے وہ سکڑا سمٹا اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پر لگتے ہیں اور وہ اس بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے "بوڑھا مر گیا۔ بوڑھا پھانسی لگا کر مر گیا"

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا مر گیا" کی آواز آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے ..... کڑکڑ..... کڑکڑ.....

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کوئی زور سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔

جلدی سے گرم جرابیں پہن، سر پہ ٹوپی پہن اور کمبل کو اچھی لپیٹ کر میں اٹھا،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سکریٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات آپکے برآمدہ میں بوڑھا مرگیا۔"

میں نے دیکھا۔ اس میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارگرد وہی میلا کچیلا لحاف لپیٹے بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا....." میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سکریٹری صاحب نے میری بات کو کاٹ دیا: "میں چائے کے لیے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا" وہ بولے "کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ٹھیکیدار کے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

اگلے دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک ٹرک کر میں نے ماہی رام سے کہا "غدا کے لیے اس پیلے سے بیگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔"

میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران میری طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے کہا۔

"بہت اچھا سرکار!"

اختر اورینوی

انارکلی اور بھول بھلیاں

اس نے ایک خواب دیکھا ــــ رات بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ رسالہ کا چھوٹا سا دفتر بس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی، اس میں ایک دروازہ جو بڑے بے ربط سے ہال میں کھلتا تھا۔ اور ایک دریچہ جس سے گلی کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا۔ گلی کے اس جانب چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی ایک بے حس بیگانہ سی دیوار۔ ماضی کی مجرد رسموں سے یا بہ گل توہمات کی طرح کھڑی ہوئی کھلے آسمان کے نظارے کو روکتی تھی۔ بے ربط سا ہال بس ایک اونچا سا شڈ تھا۔ یہاں آہنی پریس گھڑگھڑاتا رہتا تھا۔ چرخی چلتی تھی تسمے گھومتے تھے۔ دندانے وصل ہو ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ دستے تختیوں کو لیے ہوئے قیام، رکوع اور سجدہ کیے جاتے تھے اور سفید کاغذ کے سینے گیہنے بن جاتے۔ صفحات پر سطریں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سویرے سویرے سائرن بجنے کے بعد میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے مزدوروں کی قطاریں فیکٹری میں جا رہی ہوں۔ پریس گھڑگھڑاتا رہتا۔ اس کے دماغ دوزشور سے اکتا کر وہ گلی میں دیکھنے لگتا۔ وہاں بھی موٹی عورتیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیلی لڑکیاں، گندے مرد، محلہ کے لڑکے نلکے پر لڑائی دنگا کرتے رہتے۔ خوانچہ والے سودے کے اعلان کو کان میں ٹھونستے ہوئے گذر جاتے۔ اس کی میز دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ اس پر روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار اخبارات، رسالے، مصور و غیر مصور جریدے ڈھیر کے ڈھیر پڑے رہتے۔ اور معمولی سے قلم دوات، بالکل معمولی اس کی کتنی کہ ایک سلیقہ کی میز ہوتی۔ میز پوش، گلدان، گھڑی، قاعدہ کا قلمدان، ایک اچھا سا بک شلف، وہ ایک حسن مذاق رکھنے والا ادیب تھا۔ مگر ملازم، مطبع اور رسالوں کا پبلشر اس بات کا قائل تھا کہ کم سے کم دانہ گھاس پر ایک ادنیٰ سے اصطبل میں رکھ کر گھوڑے کو زیادہ سے زیادہ دوڑایا جائے۔ گھوڑے کا وہ مالک تو نہ تھا۔ کرایہ کا گھوڑا، بھاڑے کا ٹٹو۔ یہ گیا وہ آیا۔ سب گھوڑے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ اور گھوڑے بہت ہیں۔ کرائے کا ادیب اور بھاڑے کا ٹٹو۔ ادیب بہت ہیں۔

غرض دریچہ اس کے داہنے کان کے بالکل متصل تھا۔ اور گلی کی ہانک پکار اس کے کان میں یوں داخل ہوتی تھی جیسے وہ لاؤڈ اسپیکر کا بھبا ہو۔ "سردے ہیں جی پشاوآر کے سردے"

"دودھ بجری دا ہیم بے والا! یوم بی والا!" اور کوئی شوخ چشم رتال تو بس اس کے کان سے لگ کر زور سے کہتا ہے "پائی جی! تھاڈی تقدیر دی گتھیاں سلجھا واں۔ ہاتھ دکھلاؤ زائچہ بنواؤ۔ بیشک جو چاہو پوچھ لو"

وہ چونک پڑتا۔ اس کا جی چاہتا کہ رتال کا سر سامنے کی بے حس دیوار سے ٹکرا دے۔ مگر ہوتا یہ کہ دیوار خود اسی سے ٹکراتی رہتی۔ گلی کی الجھن سے تھک کر وہ اپنی میز پر رکھے ہوئے مسودوں کو الٹنا پلٹنا۔ کچھ لکھنے لگتا۔ لکھتا جاتا۔ یک بیک پریس کی گھڑگھڑاہٹ زبان اختیار کر لیتی۔ کچھ کے لگانے والی زبان۔ اس کا مضمون چھپتا ہے اور ناقدین کی کٹکچھری۔ اسے ناقدوں کی کیا پروا

ہوتی وہ ان کے پورے قبیلے کو پریس کے شیخے میں کچومر بنا کر رکھ دیتا اور اسے اتنی بھی حس نہ ہوتی جتنی سگریٹ یا سلائی کے خالی ڈبے کے کچل جانے سے ہوتی ہے۔ مگر ناقدین کی آواز پریس کے کان میں گھستی چلی جاتی ہے۔ اور غرض وہ زکا اثر قبول نہ کرنے والی ہستی یوں اثر پذیر ہوتی ہے جیسے بٹن دبانے سے الیکٹرک مشین پریس کا رولر ——— معاذاللہ! تخفیف مشاہرہ کی دھمکی اور برطرفی کے قاتل اشارات۔ تو پریس کی گھڑگھڑاہٹ ناقدوں کی جاں گسل آواز معلوم ہوتی۔ وہ مڑکر نفرت سے شیڈ کے اندر بھاری بھرکم پلانٹ کو دیکھتا۔ اور پھر خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبہ کے ساتھ آنکھیں پھیر لیتا۔ پریس میں کمپوزیٹر اور دوسرے عمال اسے فراعنہ ان حبشی غلاموں کی طرح دکھائی دیتے جن سے جلادی کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ پھر لکھنے لگتا۔ اسے کیا کیا نہیں لکھنا پڑتا تھا۔ اداریے، افسانے، نظمیں، علمی مضامین۔ پروف دیکھنا بھی اسی کے سپرد تھا اور پریس کے انتظامات بھی۔ لکھتے لکھتے وہ سوچنے لگتا کہ پریس اور رسالوں کا عملہ رومی غلاموں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آپس میں لڑ لڑ کر مرجایا کرتے تھے۔ اسے پریس مین، کمپوزیٹر اور اپنے پر رحم آنے لگتا۔ اس کی نظریں کوٹھڑی کے اس گوشے میں پڑی ہوئی آرام کرسی کی طرف اٹھ جاتیں جس پر فربہ جسم پبلشر روزانہ ایک دو گھنٹے آکر بیٹھا کرتا تھا۔ اور ترقی کے خواب دیکھتا رہتا۔

رات وہ اسی دفتر میں بیٹھا بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ دو رسالوں کا سالنامہ سر پر تھا۔ ماہوار اور ہفتہ وار جریدوں کی ساری ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر تھی۔ اسے اسی طرح اور کئی بے خواب راتیں گذارنی تھیں۔ گذشتہ رات کو اس نے ایک خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا۔ انارکلی بازار سجا ہوا ہے اپنی ساری پرکاریوں اور رنگینیوں کے ساتھ اپنی رنگ برنگ بھرپور دکانوں کو لئے ہوئے آمدورفت، خرید و فروخت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اکل و شرب نمائشیں اور حسرتیں، زندگی کی حرارت روانی اور تنوع کو پیش کر رہی تھیں۔ خواب کی دُنیا عجیب ہوتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ انارکلی سے ملحق لیکن اس کی سطح سے بلند مال روڈ اس کا زرین آسمان، انارکلی اور مال کے گرد اونچی اونچی آہنی دیواریں حائل ہیں۔ آہنی مگر شفاف، وہ باہر کھڑا کھڑا سارا منظر دیکھ رہا ہے۔ ان دیواروں سے پرے چھوٹی چھوٹی پُرپیچ گلیاں ہیں۔ اور اندھے راستے، یہ ابھی ہوئی گلیاں سب کی سب انارکلی کی طرف جانے کی سعی کر رہی ہیں۔ مگر گتھا گتھا کر بھول بھلیاں بن گئی ہیں۔ خواب ہی میں اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ پتلی پتلی گلیاں اس کی گردن میں پھندا بن کر لپٹتی جاتی ہیں۔ وہ بے تحاشا انارکلی کی طرف دوڑتا ہے مگر آہنی دیواروں سے ٹکرا کر گر پڑتا ہے۔ مال کی بلندیوں سے کچھ لوگ اسے گرتے دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں اس دل قہقہے کی نشریت سے بوکھلا کر وہ جاگ اٹھا۔

یہ تھا اس کا خواب۔ دن بھر وہ خواب کی گرانی محسوس کرتا رہا۔ وہ اس غیر مرئی بوجھ کو ٹپک دینا چاہتا تھا تاکہ سالناموں کی اشاعت کے انتظامات میں منہمک ہو جائے۔ مگر خواب بھوت کی طرح سوار تھا۔ آج حالات اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہے تھے۔

وہ بس ایک ادیب ہو کر رہ گیا تھا۔ کالج میں تعلیم حاصل کرتے وقت ادب تو محض اس کی خوبصورت ٹائی جیسا تھا۔ وہ ذوق ادب کے اعلان سے اپنی نوجوان شخصیت کی آرائش کا کام لیتا تھا۔ ورنہ اس کی تمنائیں تو آئی سی ایس کے ملاء اعلیٰ پر جا پہنچتی تھیں۔ حکومت کے گنگرے کو تحمل سے مس کرنا کالج کی طویل خوش خرام زندگی کے لیے پڑدل ہوتا ہے۔ زندگی کے ٹھوس مطالبات آرزوؤں کی حدت سے نقطۂ احراق پر پہنچ کر گیس ہی جاتے ہیں۔ اور تصورات کی پھکی چلنے لگتی ہے۔ پرواز خیال کے آگے ہربجین اور اسپٹ فائر کی رفتار ماند۔ مگر نشہ کے اُتار کے وقت صرف ڈپٹی مجسٹریٹ نظر آتی ہو

اور اس سے بھی نیچے اُتر کر تحصیلداری۔ غرض وہ ادیب یوں بن کر رہ گیا جیسے کسی ہوا باز کو "فورسڈ لینڈنگ" کرنا پڑے۔ اور وہ کسی بیگانہ سے جزیرے میں۔

بہرکیف فی الحال وہ ایک ادیب تھا۔ اس کا ایک نام بھی تھا اور اس کی ایک شکل صورت بھی تھی۔ مگر صورت شکل اور نام تو اس وقت منفرد شخص ہوتے ہیں۔ جب کوئی کامیاب حیات ہو جائے۔ اور وہ تو اس منزل کی مخالف جانب پھسلتا جا رہا تھا۔ وہ خلقت کے ہجوم میں ایک سپاٹ سا فرد تھا۔ لاکھوں لاکھ افراد کی طرح ایک فرد تھا۔ وہ زندگی کی چپٹی سطح پر ایک رینگتا ہوا ادیب تھا۔ محض ایک ادیب۔

وہ صبح سے شام تک رسالہ کے دفتر میں بیٹھا ہوا ادب کی چرخی چلاتا رہتا تھا۔ ۹ بجے صبح سے لیکر ۶ بجے شام تک، دوپہر کا کھانا وہ دفتر کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا کھا لیتا تھا۔ کسی چائے خانہ ورلنچل پھیری والے سے چند سوکھے ہوئے بسکٹ اور ایسی چائے جس کا رشتہ کتھے کے رقیق گھول سے زیادہ قریبی ہوتا وہ قہر درویش طور پر خرید لیا کرتا تھا۔ اور اب تو وہ ایسی چیزوں کو سالن کی سی یکسانیت کے ساتھ پی جاتا تھا۔ اس نے دفتر سے قریب کہنہ، فرسودہ شہر کی بوڑھی فصیلوں کے آغوش میں ایک معمولی سی کوٹھڑی کرایہ پر لے لی تھی۔ اس میں بھی شرکت تھی۔ دنیا میں کوئی چیز اس کی اپنی نہ تھی۔ گاؤں میں رہنے والے باپ ماں کی تنگ دستی و تنگ دامانی کے کسی گوشے میں اتنی ناممکن وسعت کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اسے اپنی خاص ایک دُنیا سمجھتا۔ وہاں بھی اس کے بھائی بہن شریک تھے۔ گاؤں کا مکان بھی جدی مکان تھا۔ اور یہاں امینی شہر میں اسے ایک چھوٹی سی تنگ کوٹھڑی میں بھی شرکت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اس کی اپنی ذات بھی تو اپنی نہ تھی۔ اس کے سارے اوقات، ساری مشغولیت پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رسالہ کا دفتر چھایا ہوا تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ وہ دُنیا کی کسی ہستی کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ڈبیوں کی دکان کا ایک ملازم دست فروش اس کے ساتھ رہتا تھا بس رات کے چند اندھے گھنٹوں اور صبح کی چند عاجلانہ ساعتوں کا شریک۔ وہ دونوں اس طرح ملتے تھے جیسے دو ماہانہ ٹکٹ رکھنے والے مسافر کسی ویٹنگ روم کو استعمال کرتے ہیں۔

اس کی چھوٹی کوٹھڑی میں سورج کی زریں کرنیں کبھی نہیں جھانکتی تھیں۔ پیاری پیاری نازک کرنیں اور رچی ہوئی سنہری دھوپ معمولی سی جھونپڑی میں بھی جان ڈال دیتی ہیں۔ ادیب کو اس بات کا احساس کہاں ہو سکتا تھا۔ مگر جب وہ سوکھے بسکٹ کھاتے کھاتے..... اور کام کے بوجھ سے دبتے دبتے بیمار پڑ جاتا تھا تو اسے کوٹھڑی میں دن بھر رہنا پڑتا۔ اس وقت اسے اس بات کا تلخ احساس ہوتا کہ اس کوٹھڑی میں فطرت کے ہلکے سے ہلکے تبسم کی بھی جگہ نہ تھی۔ وہاں اِدھر اُدھر گوریا، مینا، ابابیلیں کبھی آکر کھیلتی نہ تھیں۔ ننھی گوریا، پیاری مینا، چونچال ابابیلیں۔ ادیب کو اپنا گاؤں یاد آتا۔ اور اس کے درمیان سے دل میں ان پرندوں کے پیار کا درد سا اٹھتا۔ یہ پیارے گھریلو پرندے! اس کوٹھڑی کے اردگرد تو شوخ، شریر، باجی، اچکے، کائیں کائیں کرنے والے پرندے بھی نہ پھٹکتے تھے۔ پرانی وضع کی اونچی مکانات سے گھری ہوئی دکانوں کے کٹہروں کے عقب میں، گلی کے اندر، نچلی منزل کی ایک کوٹھڑی کاش وہاں ایک چوہا ہی ہوتا۔ مگر جب روٹی کا سوکھا ٹکڑا تک نہ ہو تو پھر غریب چوہا کیسے قسمت آزمائی کرے۔ بیماری میں ادیب اکثر فاقہ کرتا اور جب ذرا سکت ہوتی تو وہ اپنے اسی کھٹیا ہوٹل کا رخ کرتا۔ یا کسی پھیری والے دودھ فروش سے دودھ کا ایک کوزہ لے لیتا۔ وہ جب اچھا ہوتا تو اسی ہوٹل میں صبح کی چائے پیتا۔ اور رات کا کھانا کھاتا۔ رات کو وہ تھکا تھکا یا آکر پڑ کر بے چین سی نیند سو جاتا تھا اور خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ خواب دیکھا کرتا۔ جسمانی کام کی تھکن سے نیند تو اچھی آتی ہے۔ کم از کم مگر دماغی کام کے بوجھ سے اعصاب جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ اور نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا۔ اپنی گاؤں سے نکلتی ہوئی اسے ایک پگڈنڈی نظر آتی تھی۔ وہ پگڈنڈی سیدھی نازدان سے بڑھتی ہوئی اس عظیم الشان شہر تک چلی آتی تھی۔ یہ نازک مگر آرزومند پگڈنڈی پھیل کر، رچ اور سنور کو انارکلی بن گئی تھی کالج کی زندگی کی انارکلی البیلی، بھرپور اور شاداب امنگوں سے بھری ہوئی ارمانوں سے کھیلتی ہوئی۔ پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انارکلی جوان ہو کر مال کی ٹھنڈی سڑک بن جائے گی۔ مطلق نازاں سرشار، پھولتی پھلتی۔ گرم سیر۔ اور یہ مال وسیع ہوتے ہوتے سارا ہندوستان بن جائے گا۔ گونجتا ہوا ملک، پھر وہ اپنا سفر یاد کرتا۔ جب راوی اور گنگ وجمن کی وادیوں کو روندتا وہ سارے شمالی ہند کا دورہ کر رہا تھا۔ وہ ہر شہر میں فاتح کی طرح داخل ہوتا تھا۔ ہر شہر اسے اپنا معلوم ہوتا۔ اپنی ملکیت، سحر آگیں کلکتہ، باغ و بہار لکھنؤ خوبصورت آگرہ۔ شاندار دلی۔ یہ سارے کے سارے اس کے دل کے ایک گوشے میں آباد تھے۔

ادیب کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ رات کی چشم بیدار کے کاجل پر اس کے سفید آنسو ڈھلک کر ایک لمبی سی پگڈنڈی بنا دیتے۔ جو نہ انارکلی بن جاتی نہ ٹھنڈی سڑک۔ اسے دکھائی دیتا کہ اس کی تمناؤں کی انارکلی ایک بیدرد سے بھول بھلیاں میں اُلجھ کر گم ہو گئی۔ بہرکیف رات کٹ ہی جاتی اور صبح ہوتے ہی وہ اپنا دن دفتر کی بے کیفی میں گم کرنے کو روانہ ہو جاتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی طرح سے پانچ سال سے وہ زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ کو لا حاصل کاموں کی چٹان پر رسالہ کے آہنی دفتر میں جا کر دے مارتا تھا۔ شام کو ادیب پُر اذیت خلا میں الٹا لٹکا ہوا سا محسوس کرتا۔ دفتر کا ناقابل اختتام کام ختم کر کے خالی خالی وہ گلیوں اور بازاروں سے گذر کر اپنے مخصوص گھٹیا سے ہوٹل میں جاتا۔ اکتایا ہوا، بے یقین۔ بے مقصد۔ ہر شے اسے دھواں دھواں سی مبہم۔ غیر حقیقی اور بے معنی معلوم ہوتی۔ وہ زندگی کو چھو کر اپنی زندگی کا ٹھوس احساس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر سارا شہر، ساری کائنات اسے جادو سے بنی ہوئی محسوس ہوتی۔ دیواریں پگھلتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ مکانات محلول ہوتے ہوئے اور قدیم شہر کی بے محل فصیل بخارات میں تبدیل ہوتی ہوئی سی معلوم ہوتی۔ اسے نفی حیات سے سخت دُکھ پہنچتا۔ وہ بڑی بے تابی سے چاہنے لگتا کہ یہ بھری دُنیا قائم رہے۔ لیکن جو سماء میں یہ ناچیز کرۂ دخانی کی صورت اختیار کر کے تحلیل ہوتا جاتا۔ وہ اسے بچانا چاہتا مگر اس کے پھیلے ہوئے نامراد ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ جاتے۔ وہ تیزی سے سانس لے کر مٹتی ہوئی زندگی کی ایک ایک رمق کو اپنے اندر جمع کر لینا چاہتا تھا۔ اس کیفیت میں کبھی کبھی وہ دیر تک بازاروں اور گلیوں میں یونہی آوارہ پھرتا رہتا۔ اور جب یہ احساس دردناک حد تک بڑھ جاتا تو وہ اپنی کوٹھری میں واپس آجاتا۔ اس وقت اسے اپنی کوٹھڑی کی فرسودہ و مضمحل مگر جانی بوجھی اور محدود فضا زیادہ یقینی اور قابل اعتبار معلوم ہوتی۔ اسے اپنے ساتھی کے خراٹے بھی بھلے لگتے۔ زندگی کے ذرّے پر ایک قدم رکھ کر وہ مینار سے پھسل جانے کی پُر الم غیر یقینی کیفیت سے نجات پا جاتا تھا۔ بلندی سے گرتا ہوا انسان ماحول کی اشیاء کو بھی قلابازیاں کھاتے ہوئے اور ٹھوس حد بندیوں کو غیر واضح ہو کر بکھر جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ بھرے بازار اور رچی ہوئی

دنیا میں ادیب اسی نوع کے فریب نفل میں مبتلا ہو کر اذیت اٹھانے لگتا تھا۔ اور اپنی ہیچ سی، بے مایہ کوٹھڑی میں اس کے تصورات کو ٹھیک سی بل جاتی تھی۔ اور تقابلی طور پر سکون مل جاتا تھا لیکن پھر صبح ہوتے ہی یہ کوٹھڑی دوسرے مکانات کی دیواریں اور قدیم شہر کی بے مہر فصیل اس قدر مخالفے کے ساتھ ٹھوس، مستحکم، منجمد اور اٹل ہو جاتیں کہ وہ ان کے درمیان یوں محسوس کرتا کہ وہ ایک چنا ہے اور اوپر کا پاٹ بے چلے ہوئے اسے دبا کچلا جاتا ہے۔ وہ اپنی پسلی کی ہڈیاں کڑکتی ہوئی محسوس کرتا اور سر کی کھوپڑی تڑختی ہوئی۔

اسی طرح وہ کام کئے چلا جاتا تھا۔ چھ سال قبل کا خوش باش و دوست دار نوجوان اپنے احباب سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ہر وقت منجمد سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں یا شناساؤں کو اپنی کوٹھڑی یا رسالے کے دفتر میں لانا اپنی تضحیک سمجھتا۔ وہ اپنی پستی کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کا دوست دور دراز علاقے سے آیا۔ اس ملاقات سے اُسے سخت الجھن ہوئی۔ دفتر کی کوٹھڑی میں دونوں آمنے سامنے دیر تک بیٹھے رہے۔ کچھ یونہی سی رسمی اکھڑی اکھڑی باتیں ہوئیں۔ اس کی دور بیز آنکھوں سے آشکارا تھا کہ وہ اس وقت یہی محسوس کر رہا تھا گویا کوئی جیتے جی اس کی کھال ادھیڑ کر اس کی چیر پھاڑ پر تلا ہوا ہے۔ لیکن نگاہوں میں التجا تھی اور کرب کاش اس کا دوست نہ آیا ہوتا! ایک سال سے وہ اپنے گاؤں نہ گیا تھا۔ وہ تو اپنے کو مطلع کی مٹھی کے ایک پُرزے کی طرح بنا دینا چاہتا تھا۔ اتنا ہی بے احساس، اتنا ہی نا دیدہ۔ وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ کسی سے نہیں ملتا تھا۔

مگر آج رات کا خواب اس کے احساس کی چنگاریوں کو زندگی کی خاکستر سے کرید کر نکال رہا تھا۔ خود اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مبہم طور پر بے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چین ۔ بے کسی کام میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا ۔ آئے ہوئے مضامین کی اصلاح و ترتیب ہو رہی تھی ، نہ ادیبوں کو خط لکھے جا رہا تھا ۔ اس نے پیڈ اٹھایا ۔ ملک کے مشہور شاعروں اور افسانہ نگاروں کو خط لکھ کر مضامین اور نظموں کی استدعا کرنی تھی ۔ پر وہ ایک سطر بھی تو لکھ نہ پایا ۔ اسے غیر واضح ڈر سا محسوس ہو رہا تھا کہ مضمونِ خط میں کچھ بھونڈا پن رہ جائے گا ۔ بس سے اس بیگی ہو گئی ۔ وہ ٹی ۔ ایچ لارنس کے ایک افسانہ کا ترجمہ کرنے بیٹھا ۔ ایک دو جملوں کے بعد اس کی طبیعت کی نارسائی کھلنے لگی ۔ پھر اس نے ایک المیہ قلم لکھنے کی ٹھانی ۔ دو بند بڑی سرعت سے وہ لکھ گیا ۔ تیسرے بند پر موزونیت آکر جو اٹکی تو دس پندرہ منٹ کے بعد وحشت ہونے لگی ۔ اس نے ادب دب کو تہہ کر کے رکھ دیا اور لگا سالنامہ کے لیے اب تک کے خرچ کا حساب پڑتالنے ۔ مگر ہر دفعہ جوڑنے گھٹانے میں غلطی پر غلطی ہوتی جاتی اور بہت سے خرچ مدیں یاد نہیں آتی تھیں ۔ اس نے اکتا کر رجسٹر پٹک دیا اور مطبع میں لیتھو کے پتھروں کو دیکھنے چلا گیا ۔ کئی پتھروں پر الفاظ کھے جا چکے تھے ۔ ذمہ دار عملہ سے اس کی تو تو میں میں ہو گئی چڑچڑا کر وہ شڈ سے باہر گلی میں نکل آیا ۔ نکڑ پر ایک دس سالہ لڑکی تھی رہی تھی ۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا ۔ اس کے بھیگے ہوئے کپڑے جسم سے چپک چپک کر بدنما معلوم ہو رہے تھے ۔ اس حال میں اس کا دبلا پتلا جسم اور نحیف دکھائی دیتا تھا ۔ لڑکی کے پھٹے پھٹے جسم میں اسے ناگوار سی زبونی کا تلخ احساس ہوا ۔ وہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں کچھ کمی کا احساس پا رہا تھا ۔ وہ پھر دفتر کی کوٹھڑی کے اندر چلا گیا ۔ اب اس نے پروف دیکھنے شروع کئے ۔ اس میں کتابت کی اتنی غلطیاں تھیں کہ وہ سالنامہ کی طرف سے مایوس سا ہونے لگا ۔ اسے اپنے پر اعتبار نہ تھا کہ وہ اس قسم کے سارے اغلاط کی تصحیح کر سکے گا ۔ پریس کسی سینما کا اشتہار چھاپ رہا تھا ۔ اس کی سمع خراش گھڑگھڑاہٹ ادیب کے لیے

ناقابلِ برداشت ہونے لگی ۔ وہ آپ ہی آپ چڑچڑانے لگا ۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ یہاں سے ان ساری مشینوں کو توڑ پھوڑ کر بھاگ جائے ۔ اور بس بھاگتا چلا جائے ۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ اپنا پرانا گرم کوٹ پہن لیا ۔ اور پھر کرسی کا پشتہ پر کوٹ میز پر پڑے ہوئے اغلاط کو مبہم طور پر تکنے لگا ۔ رات کا سارا خواب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ پھر اس کے اندر عجیب سی بے چینی شروع ہوئی ۔ وہ مطبع کے دفتر سے باہر نکل آیا ۔ اور تیز قدم اٹھاتا ہوا پرانی فصیلوں کی تنگ آغوش سے باہر نکل آیا ۔ مہینوں کے بعد اس نے ایسا کیا تھا ۔ کئی ماہ ہوئے وہ کاغذ کی منظوری خریداری کے لیے اس حلقے سے باہر نکلا تھا آج اس کا جی چاہتا تھا کہ ساری ذمہ داریوں کو پھینک کر آزاد پھرا پھرے ۔ بغیر سوچے سمجھے اس کے دل میں بہت سی واضح غیر واضح خواہشیں پیدا ہوئیں ۔ اور بہت سی نفرتیں جاگ اٹھیں ۔ اس کی حیات کا بند سرچشمہ محبت و نفرت لیے ہوئے آج چھوٹ بہا تھا ۔ آج وہ شالامار جانا چاہتا تھا ۔ انارکلی کی سیر دل بھر کے کرنا چاہتا تھا ۔ ٹھنڈی سڑک پر آدھی رات تک سرگرم نظارہ رہنا چاہتا تھا ۔ اور پھر نہ جانے کیا کیا کرنے کا آرزومند تھا ۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کیا کیا ، پر ایسا لگتا تھا کہ اور بھی بہت کچھ کرنے کو ہے ۔

وہ باہر نکلنے سے عموماً اس لیے بھی گھبراتا تھا کہ اس شہر میں ہر جگہ ادیب و شاعر ہوتے تھے ۔ اور ان اخبار و شعراء کے درمیان افسانہ فرق مراتب اور تاجرانہ رقابت و ساز باز پائی جاتی تھی ۔ یہ بیچارے ادیب کے لیے بہت روح فرسا چیز تھی ۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں ان حضرات میں سے بزعم خود کوئی اونچا ادیب سر راہ نہ مل جائے ۔ مالی طور پر کامیاب ادبا و شعراء بڑی منزل والی ہستیوں کو بس ایک رینگتا ہوا کیڑا سمجھتے تھے ۔ کامیاب ادیب بننے کی اسے تمنا تو ضرور ہوتی رہی تھی ! مگر اپنے افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ کبھی اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا تھا ۔ ہاں وہ یہ ضرور سمجھتا تھا کہ اگر اسے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فضا سازگار مل جاتی تو وہ بہتوں سے آگے نکل جاتا۔ لیکن حالات نے رفتہ رفتہ اسے کچلا تھا کہ اب تو وہ اپنے کو بالکل بے وقعت سمجھنے لگا تھا۔ بے نام و نشان، نیم ادبی، و نیم تاجرانہ رسالوں کے دفتر کا حقیر سا ایک ملازم۔ وہ کبھی کبھی اپنا نام زیر لب لیتا۔ اسے دو ہراتا اور کئی بار اس کی تکرار کرتا۔ مگر نام کے کوئی معنی مرتب نہ ہونے کو مئی شخصیت ابھرتی نہیں۔ وہ تو گا ہے آئینہ دیکھنے سے بھی جھجکتا تھا۔ دوسرے ادبا سے ملنا ملانا تو اس کے لیے وبال جان ہوتا تھا۔ مگر آج اس کے دل میں تمناؤں کے ساتھ نفرت بھی جاگ اٹھی تھی وہ شہر کے شعرا، ادبا سے اتنی نفرت کر رہا تھا کہ وہ سارے کے سارے بے وجود ہو کر رہ گئے تھے۔ آج وہ ان کو استغنا کے ساتھ نظر انداز کرتا ہوا ان کے سامنے سے گذرنا چاہتا تھا۔

اس کے قدم آگے بڑھتے گئے اور وہ کشاں کشاں لارنس باغ جا نکلا۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ دوپہر کی ہلکی سنہری دھوپ لارنس کے درختوں سے اختلاط کر رہی تھی۔ اکا دکا لوگ باگ سیر کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ ادھر ادھر ٹولیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ یہ باغ اس کے لیے نیا نہ تھا۔ لیکن اس وقت اسے نیا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ہمدردی و وسعت "اس کی آبادی" اس کا سکون ادیب کے لیے نا آشنا سی مسرت پیدا کر رہے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چپہ چپہ پر لیٹ کر سبزۂ بیگانہ کو جو ابھی ابھی بیگانہ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی آغوش میں لے لے اور خود اس کی گود میں چلا جائے۔ وہ بلند و بالا درختوں سے لپٹ جانے کا آرزومند تھا۔ آخر وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس اقدام سے اسے ناقابل بیان سرور حاصل ہو رہا تھا۔ خاص سرور۔ ٹیلے کی مذکر صورت، اس کا بھرپور گداز اور دعوت کناں رفعت! اوپر جا کر ادیب لیٹ گیا اور نیلے آسمان میں اپنے تصورات، خیالات اور اپنی آرزوؤں کو گھولنے لگا۔ زمین کی کھلی آغوش اتنی پیاری معلوم ہوتی اور اتنی

محبت کناں کہ لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں درد الفت اور بہجت سپاس گذاری کے آنسو امڈ آتے۔ آسمان کی آزادی بخش روحانیت، اس منزہ مطہر فضا ادیب کی روح کو اپنی طرف بلند کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آسمان نیلا نہ ہوتا تو فطرت کی کتنی نامہربانی ہوتی۔ آسمان کی نیلاہٹ آج اس کے لیے نیا پیام تھی۔ وہ اپنے خواب کو اس کی گہرائیوں میں تحلیل کر کے پھیکا، بے اثر بچ کر چکا تھا۔ فی الحال وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کا ایک جز محسوس کر رہا تھا۔ اور ان کی عظمت، وسعت، رفعت اور محبت کا شریک رخصت ہوتا ہوا آفتاب رقص کناں پتوں پر آب زر چھڑک رہا تھا۔ جس کے چھینٹے ادیب پر بھی چھن چھن کر پھوار کی طرح گر رہے تھے۔ وہ ازلی و ابدی لذت و سرور میں گم تھا۔

ایک ریشمی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کی۔ ایک جوڑا ٹیلے کی خاموش تنہائیوں میں مخل ہوا تھا۔ ادیب کو انھیں دیکھ کر وقت کا احساس ہوا۔ اس نے نیلی ساٹن کی شلوار اور استرخانی اوور کوٹ کو عجیب بیگانہ نظر سے دیکھا۔ اور اس کے اندر ملفوف ہستی کے متعلق جاگتے خواب دیکھنے لگا۔ آنے والا جوڑا بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور مرد چڑھ چڑھ کر اپنی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ادیب کو تلخ بیگانگی کا احساس ہوا۔ اس نے پناہ کے لیے لڑکی کی آنکھوں کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ مگر وہاں اسے نمایاں بے توجہی اور دل شکن بعید سی فطرت کا سراغ ملا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ اور شاید فردوس گمشدہ آدم سے بھی زیادہ تلخ کیفیت میں مبتلا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر بے خبری کے عالم میں لارنس سے باہر نکل آیا۔ کھوکھلی سی روح فرسا کمی کی تلخیاں لیے ہوئے وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ بالکل غیر شعوری طور پر وہ ٹھنڈی سڑک سے بھی گذر گیا۔ اور اسے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ وہ زمان و مکان کے بے رنگ و نور خلا میں اڑا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل سینے میں نہیں اس کا دماغ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کھوپڑی کو خالی چھوڑ کر فنا ہو گیا۔ ساکن، ویرانی، لا انتہا، بے آسرا مجہول۔ راہ میں انارکلی بھی ملی۔ آباد پر رونق، رواں دواں، سرگرم، رنگین گویا خنداں انارکلی۔ مگر وہ گزرتا گیا۔

کون جانے وہ کہاں جاتا۔ مگر اسے لاہوری دروازہ پر شہر کا ایک اور ادیب مل گیا۔

"کہیے جناب سالنامے کب نکل رہے ہیں؟ مضامین کی آپ کے پاس کمی تو نہ ہوگی؟ کیوں؟"

وہ چونک پڑا۔ ٹھٹک گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے دفتر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر وہ قدیم شہر بے رحم فصیلوں، تنگ ظرف گلیوں، اور اندھے بہرے گونگے مکانات کے اندر اپنے کو دفن کرنے سے گھبرانے لگا۔ وہ پلٹ پڑا۔

وہ ایک بار پھر انارکلی میں تھا۔ شام جوان اور رسیلی ہو کر رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ برقی شمعیں جل چکی تھیں۔ دکانیں دلہنوں کی طرح سجی ہوئی تھیں جیسے کاجل حسین آنکھوں کو محشرستان بنا دیتا ہے۔ اسی طرح رات نے انارکلی کو جادو نگار بنا دیا تھا۔ زرین کلاہوں سے لپٹی ہوئی پگڑیاں، خوش وضع سوٹ، نئی قراش کے سویٹر، گلوبند، مفلر، چمکتے ہوئے جوتے، بہرائی ہوئی طرحدار گرگابیوں سے نازونیاز میں مشغول تھے۔ دکانیں اپنے نرالے لٹا رہی تھیں اور جیبیں جذبۂ عطا سے لوٹی پڑتی تھیں۔ گوری گردنیں فسانۂ بازوؤں کو حمائل ہونے کے لیے ٹیلا ہی تھیں۔ بالاؤ بلند سرو ناز و عوت نظارہ دے رہے تھے۔ جسموں کے مدوجزر سے جذبات اور تخیل میں نقرئی لہر نگ پیدا ہو رہی تھیں۔ دائرے اور خطوط، تشبیب و فراز، نور اور سائے، صورتیں اور خیال، خندہ ریزیاں اور مسکراہٹیں، گفتگو اور سرگوشیاں، حرکت و سکون سب مل کر زندگی کے تنوع کا ایک مجموعی احساس پیدا کر رہے تھے۔ تانگے اور

موٹریں، ریڑیوں کے نغمے اور ہوٹلوں سے آنیوالی اشتہا خیز خوشبوئیں، گیزہاں دامنوں کی عطر بیزیاں، خوبصورت ہمکتے ہوئے بچے اور ان کی گداز سینہ مائیں۔ جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں۔ اور مرد۔ چھلکتے ہوئے پیمانوں کی طرح کالج کے بالیدہ نوجوان اور شوخ چنچل اور تھرکتی ہوئی تیتریاں یہ ساری موجیں انارکلی کے ایک دھارے میں وصل ہو ہو کر غلطاں و رواں تھیں۔ زندگی کی گرم سانسوں سے سڑک اور دوکانوں کی فضا ایسی بوجھل ہو رہی تھی جیسے پربہار کی سہ پہر کو دامن چمن۔ ادیب مسحور ہو کر رہ گیا۔

وہ کپڑوں کی دوکان میں گیا اور سوٹ کے طرح طرح کے کپڑے نکلوائے ٹویڈ، سرج، ونسٹیڈ، گبرڈین، فلالین، کشمیرے، استرخان، پشمینے۔ یہ سب چیزیں نکلوا کر اس نے اس طرح دیکھیں جیسے وہ بہت سی شیروانیاں بنوائے گا۔ بہت سے کوٹ اور ایک دوچسٹر اور اوورکوٹ۔ اس نے قمیص کے کپڑے ملاحظہ کیے۔ سوئیٹر کے نئے نئے ڈیزائن۔ بہت سنجیدگی سے پسند کرتا رہا۔ پھر وہ جوتے اور ٹوپیوں کی دکانوں میں باری باری گیا۔ اور جدید فیشن کی چیزیں دیکھیں بھالیں۔ پارچوں کی دکان میں اس نے کریم، پاؤڈر اسنو، سینٹ، پائنابے، ٹائیاں اور رومال۔ بٹنوں کے سٹ نکلوائے۔ اور ان سب کا اس طرح جائزہ لیتا رہا جیسے وہ الہ دین ہے۔ اور دنیا کے کسی جادوگر نے ایسے باغ میں پہنچا دیا ہے جہاں مرجان کی شاخیں، نیلم کے پتے، زبرجد کی کلیاں، لعل و یاقوت کے پھول پھل ہیں۔ اس پر ایک عجیب حال طاری تھا وہ اس سنجیدگی کے ساتھ دکان دکان پھر رہا تھا جیسے وہ ان چیزوں سے اپنا دامن کو بھر لے گا۔ مگر وہ ہر دکان سے یہ کہہ کر لوٹ آتا کہ یہ چیزیں پسند نہیں آئیں۔

ایک دکان سے اس کی توجہ اپنی طرف پھیر لی۔ وہ دوکان کا ایک نمائشی مجسمہ تھا۔ ایک عورت کا مجسمہ، اگرا سے سچ مچ کی خوبصورت ساڑھی پہنائی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گئی تھی۔

اس کی طبیعت میں گداز پیدا ہوا، دل میں درد اٹھا ہلکا، مگر قلب کی گہرائیوں میں پیوست، بیساختہ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس مجسمے سے لپٹ کر رونے لگے۔ وہ اس مجسمہ کو پہچان سا رہا تھا۔ جیسے وہ ایک بچھڑی ہوئی عزیز ہستی سے سرِراہ زمانے کے بعد ملا ہو۔ ادیب کے دل میں اچانک ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ انارکلی کی ساری چیزیں اس حقیقی مگر موہوم وجود کے قدموں پر لاکر ڈال دینا چاہتا تھا۔ اسی جذبہ کے ماتحت اس نے پھر دکانوں میں ساڑھیاں بلاؤز کے کپڑے، گرگابیاں اور زنانہ سوئٹر دیکھنے شروع کئے۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے ساڑھیاں، بلاؤز، گرگابیاں گھر میں کافی ہوں۔ اور فی الحال ضرورت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم سوئٹر کوٹ ہو۔ اس نے دس بارہ ڈیزائن دیکھنے کے بعد ایک سرمئی رنگ کا فرداری زنانہ سوئیٹر کوٹ پسند کر لیا۔ دکان دار سے مول جول بھی ہوا۔ بات طے ہوگئی۔ پیکٹ بند ہوگیا۔ اور اسے خرید لینے کی لذت بھی حاصل ہونے لگی۔ قیمت ادا کرنے کے لیے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس نکالا۔ اسے کھولا۔ اس کے اندر صرف چند آنے پیسے تھے اسے خود بھی جیسے تعجب سا ہوا "اچھا! اوہو! بڑی غلطی ہوئی میں کافی روپیہ ساتھ نہیں لایا۔" اس نے بغیر جھجک، بلا حجاب دکان دار سے معذرت کی۔

"کوئی حرج نہیں۔ آپ کی پسند کی ہوئی چیز ایسے ہی رہنے دیتا ہوں آکر لے جائیے گا۔" دکان دار نے جواب دیا۔

"بس، اسی پیکٹ میں۔ میں ابھی آیا۔"

وہ دکان سے باہر چلا آیا۔ اس گویا سوچا کہ ایک کام رہ گیا ہے اسے کرتا ہی چلے کھلونوں کی دکان پہ جا کے اس نے تین آنہ کی ایک گڑیا لی۔ اور دو آنے کا ایک باجہ۔ وہاں سے سیدھا اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

جیسے واپس آکر اسے فوراً سوئیٹر کوٹ لے جانا ہے۔ کوٹھڑی کے دروازہ پر اسے رسالوں کے دفتر کا ایک کاتب ملا۔ کہنے لگا،

"آپ کی تلاش ہو رہی تھی جی۔ پتہ نہیں آپ کہاں چلے گئے تھے؟ مولوی صاحب ناراض ہو رہے تھے۔ کئی آدمی آئے آپ کو ڈھونڈھنے۔"

ادیب کو ایسے معلوم ہوا جیسے اچانک وہ دوسری دنیا میں آگیا جو بیحد جانی بوجھی ہوئی اور قاتل ہو جانے تک گلوگیر تھی۔ اسے اتھاہ ڈبو دینے والی تکلیف کا احساس ہوا۔

وہ دفتر نہیں گیا۔ بلکہ کوٹ پہنے ہوئے بستر پر اس طرح دھم سے گر کر لیٹ گیا ——

اس نے سوئٹر خرید لیا تھا۔ اسے لیکر وہ گھر واپس لوٹا۔ وہ جانی پہچانی ہوئی عزیز ہستی جو اب اس کی رونقِ کاشانہ ہو چکی تھی۔ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ بہت سے گلے شکوے ہوئے۔ اور بہت سی پیار کی باتیں سوئٹر جدید وضع کا سرمئی سوئٹر اور اس پر سیاہ فر۔ اس عزیز ہستی نے سوئٹر پہن لیا۔ گوری گوری گردن پر سیاہ فر۔ جیسے رات کی آغوش میں چاندنی مچل رہی ہو۔ وہ کتنی حسین کتنی وفا شعار، کتنی محبت کناں، تھی۔ ادیب کی دنیا کیسی کامراں، کیسی خوش آئندہ، کیسی شاداب تھی۔ اس نے اپنی نازش حیات کو گلے لگا لیا جیسے وہ بالکل بھول گیا تھا اچانک اپنی جیب سے اس نے کھلونے نکالے اور اپنے بچے کے لیے بھی تحفہ دینے لگا۔ اسے اپنے بچے کا کتنا خیال تھا۔ پیارا سا ہمکتا ہوا بچہ، پر بچہ سامنے نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بچہ بھی سامنے ہوتا۔ اور ماں بچے کو گڑیا لے کر ہنستے کھیلتے تو اور زیادہ خوش ہو جاتی۔ مگر جب وہ اپنی سرمایہ زندگی کو بچے کے کھلونے دینے لگا۔ تو وہ رنجیدہ ہو کر ہٹ گئی۔ مغموم، دل شکستہ، دردناک اور سرد آہیں بھرنے لگی۔ اس نے نہایت ہی اداس لہجے میں کہا ——

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"بچہ! مجھے بچہ کہاں؟"

اب وہ جانی پہچانی ہوئی عزیز ہستی مجسمہ بن گئی۔ بالکل مجسمہ، ساکت، بے حس، بے جان!

ادیب بے تاب ہوگیا۔ اتنا بے تاب کہ اس کی نیند اچٹ گئی۔ وہ بیدار ہوگیا۔ اس پر اذیت، تلخ اذیت کا احساس طاری تھا۔ کوٹھڑی میں اس کا ساتھی خراٹے لے رہا تھا اور وہ کوٹ کی جیب سے کھلونے نکال کر گڑیا کی ٹانگ اور ہاتھ اکھیڑ رہا تھا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔

اس نے پھر یہ دوسرا خواب دیکھا تھا۔

اختر حسین رائیپوری

مجھے جانے دو

"مجھے جانے دو" اس نے کہا۔ اور جب تک میں اسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھپک اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گذرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پایا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستیں بنیان پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو پھانسنے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے مصنوعی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر رواں تھرتھرا کر کہہ رہا تھا ——

ہمیں لے لو —— ایک روپیہ کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھونک دیتی تھیں۔ اور کوئی منچلی کسی بدنما ڈرائیور کے جوتے پر پان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھل کھلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبان حال سے کہتی تھی ـــــ ہمیں لے لو ـــــ ایک روپیہ کے بدلے۔

ٹرام پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گذرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت، نسوانیت کی کلنگ۔ خدا غارت کرے۔ چند ٹکوں کے لیے، شراب کی بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہے ـــــ اور ہم؟ ـــــ پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنھوں نے انھیں اونچی حویلی ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔ شام جب آرتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتی تو مٹی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے۔ اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی جو لوگ درشن کے لیے آتے، وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بیباکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے۔ جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا احساس مطلق نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اطمینان سے آرتی کا تماشہ دیکھتی۔ اور وقتاً فوقتاً کیرتن کے لیے پر پیروں سے ٹھیک دینے لگتی۔

جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بیتال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پنواڑی کو پکار کر کہتی ـــــ "ارے ذرا سی سُرتی تو بنانا۔"

اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا۔ اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی ـــــ "ارے اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے ـــــ؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر سے گذرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم جھولیوں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی، خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آجاتیں۔ دور ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا حتیٰ کہ پیر شل ہو جاتے تھے۔ میں یونہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ اندر سے شریف اس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوئے ٹیکسیوں میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں اوباش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پنجے دبائے بھاگتے نکل آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے کیوں کر ہم کلام ہونے کی جرات کی تھی۔

محمد یونس بیگ
مکان نمبر 50، بلاک نمبر 15، گلشن اقبال، کراچی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں ٹلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان سماج کی قبر میں چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اس نے مرتے مرتے کہا "میری پیپ تمہارے جسم کو سڑائے گی، میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔"

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایک خلا جس میں کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔

شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے، وہاں سے ایک اڈھا خرید لاؤ۔"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا برا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے۔ جیسے بھینس کے تھن سے دودھ ٹپک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے اندر مستوائے مل کر گا رہے تھے۔

"ایکا نمبروں کا آآآآ... بہا آآآ... بڑے نالا..."

میں نے جلدی سے ایک اڈھا خریدا۔ اور دوائی کی چاٹ چٹپٹی مسالے دار۔

اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا۔ اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر لوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں دو تین ستارے چمیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

"بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا مدعا زبان سے بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے۔ اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے، جب عورت خود اس سے پوچھے گی، تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اتار لی سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر باہر دیکھنے لگی۔ میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں

پھر وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل غازہ اور لاکھے کو دھو ڈالوں تو کیا رہ جائے ——— دھندلی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں اندر سے کھوکھلی ہوگئی ہوں۔ مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہوگی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے!"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں؟ یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے۔ مرد ——— سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ!

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس۔ تو تم آتے ہی اسے توڑ دیتے۔ یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو درندوں کی طرح دیکھتے ہی ہمارے سینوں پر آتے ہیں ہمیں کتوں کی طرح بھنبھوڑتے ہیں اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے پلوں میں دو چار کلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھر والی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لیے روٹیاں اور سلگار کے لیے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اجالے میں جب تم لوگ ادھر آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔ ان ٹکیتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں۔ انہیں شہر سے نکال دینا چاہیے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو۔ اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ اپنا تم منہ کالا کر کے اپنی حرام کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو۔ اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے؟"

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے در و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مرجاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم جا کر ان کے مولانا نورالاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں، اور تمہیں شرافت کی قسم کہ وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے نکل کر کہنا۔ مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق دل بور نہ ہوں۔

اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے، تو تم کہنا۔ میں آپ کی بیٹی کے جنازہ کا تماشہ دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے ایک مردِ مومن نے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر ڈال لیا۔ اور اس طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپ کے ہم جنسوں نے تحفہ میں اسے گھناؤنی بیماریاں دیں۔ اور جب وہ مرگئی تو آپ کے حافظ نے اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ جب تم یہ کہہ چکو گے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے۔ لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا!

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی تھی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیچھے رو رہی ہے؟ تم لوگ جانوروں رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ——— مگر عورت! آہ عورت پر ظلم کیوں کرتے ہو۔

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ کرتی ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجدان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہم انھیں زنا بالجبر، اغوا، اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! ——— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا اگر اس کی جنت میں حوروں کے لیے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا

اب ہوا چل رہی تھی۔ اور تاڑ کے پتے غم ناک آواز میں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ دور کے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی "میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے۔ اور اب اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایۂ حیات اسے سونپ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے وہ پلیگ میں مر گیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش وہ ہماری محبت کو اخلاق کی مہر مل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا۔ اور وہ پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں جب ماں کے آگے اس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو اور جس عورت کے آگے اس کے محبوب کا جنازہ، اسے تسلی دینے کا اسلوب کوئی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو؛ میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر بیہوش ہو گئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہے۔

الہ آباد..... میرے نسبتی خالو کا مکان..... میری مرضی کے خلاف عصمت دری..... بدنامی کا ڈر..... کلکتہ..... یہ چکلہ

زیر اب وہ ٹوٹے پھوٹے جملے دوہراتی رہی اور چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی "کیا تم جا رہے ہو؟" اس نے اداسی سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا تو جاؤ خدا حافظ۔ اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا اور یہ اس کے بچوں کو ورثہ میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکہ داروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔

مگر کبھی کبھی آکر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ دیر نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں، ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لیے چلے جاؤ۔"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر میں گرفتار نظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہ سکا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میرا نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یونہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" اس نے کہا ——— اور وہ چلی گئی۔

چودھری محمد علی

تیسری جنس

مدی کا اصلی نام احمدی خانم تھا۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں تو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کی مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر ہماری سے قطع نظر کیجیے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کھل گیا دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ ہونٹ کی شرم، نہ لبھاؤ ٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لیے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز مہین۔ چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی، میں مدی سے بہت بے تکلف تھا مگر عشاق میں کبھی نہ تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے۔ ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوشِ حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جائیے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی۔ جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم

اپنے بوڑھ والوگ اس کو مردہی سے منسوب کرتے ہیں یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان ہوتا تھا۔ اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے۔ تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجئے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات۔ کچھ خاص خاص کمزوریاں بھی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے۔ مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حقدار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ دو تھان رادھا نگری ڈوریے کے لیے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی یہ ڈوریہ کیسا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لیے۔ ڈوریہ وضعدار ہے، سلنے پر اور کھلے گا۔"

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لیے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

"خیر بھئی!"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں "میاں حسن علی آجکل بازار میں مچھلی نہیں آتی؟"

آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے صبح کو مرغ بگ جاتے گا" تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے۔ اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھبو داڑھی پر چھدری ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے لوگ کوئی نہ کوئی فی نکالیں گے۔

بہر حال اہلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے وہ یہ تھا کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہان میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلو تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے د کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی

تھی کہ جب کھانا کھاتے۔ تو حسن علی کی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے۔ کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحبِ اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہوگا۔ دسترخوان پر شوربا گرانا۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پورا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے یہی ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلوانا۔ کھانا پکوانا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب رنگ اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھیں تو آئینے کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انھوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں لیجئے صاحب شادی ہوگئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولھا بھی تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھیں۔ گنیں بھی تو کھڑی سواری۔ بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آگئیں سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہونے کی پالی ہوئی تھیں۔ عمر بھر امیری کا رخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوار پنے کی آب نہیں رہ جاتی تو شہاگ کی توفیق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی ہیچ مرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا اس لیے چپ تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر اُدھر دیکھا۔ دلائی جھاڑی۔ پائینتی جھک کے دیکھا۔ گھر میں ادھر اُدھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہوگئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی۔ انھوں نے سنتے ہی

کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولھا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجئے صاحب شوہر ہی روٹھ گئے دو چار کے دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک دو زمدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا۔ اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرامزادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہوگئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا۔ داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پن ہی کر بیٹھے اس لیے مدی کا ہونے طور سے تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لیے معطل کر دیئے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہوگئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہوگئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے۔ مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لیے علیحدہ گھر اور کچھ بودگی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہوگیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی اولاد نہیں تھا یا بیکارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہوگئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ بی مدی نے سنبھالا ہی پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چارپائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انھوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون

مسز وقار لائبریری
50 نمبر 15 بلاک نمبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں واب صرف بی مدی ا ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا بُرا کیا ہوگا اس کی ذمہ داری ص ان کے اوپر نہ تھی کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم د تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اسکے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھیں کسی کو اگر روپئے دو روپئے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیئے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانا نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آتے۔ روٹی اپنی پکاتے دال بی مدی کی ہانڈی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پان سے کھاتے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کیلیں لیں، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوتی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ سلسلہ

آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی برگت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی باتیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بیس بائیس برس کے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے نسبتہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چکلی ہڈیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرتا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہوگی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں یہ چیزیں فطری ہیں۔ اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا۔ مگر دعائیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنے ہی جنس سے تعلق اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضہ سے ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنیے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی اس کے بعد لڑائی ہوگئی کس بات پر بگاڑ ہوگیا یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ عورت جس راہ آئی تھی اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی پجڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جو ئندہ پا بندہ، تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر ؎

نہ بیوفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کہوں آغاز آشنائی ... کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا اسی لیے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامنگیر ہوئی۔ بی مدی نے تھیلے کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر

ہوگئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کیے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضرورت کا بساط خانہ بھی منگوا لیا چکن کروشیا کا بھی ڈھیر ڈالا۔ بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقے کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لیے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا "بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے" بی مدی بول اٹھیں "سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنھوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے ہمیشہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کرینگے۔ جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی بچائی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھہرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلیغم باغور تھے۔ جی چاہے انگنی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کنی گھنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

دیوندر ستیارتھی

گنگ پوش

اور سب پھول بہار میں کھلتے ہیں۔ مگر کیسر خزاں میں کھلتا ہے۔ وہ نہالی ابابیل جو ابھی ابھی اس ٹیلے سے پنکھ پھیلا کر اڑ گئی۔ شاید کیسر کے پھولوں کو بھر کے دیکھنے کے لیے ادھر آ بیٹھی تھی۔ کیا دھرتی کبھی اتنی بانجھ ہو جائے گی کہ کیسر اگنا بند ہو جائے۔

کتنی پھبن پھل ہے یہاں۔ یہ لڑکیاں ہیں یا رنگوں کی پریاں؟ کیسر کے پھول چن رہی ہیں۔ ان کے اعضا کا تناسب دیکھتا ہوں تو اس بت تراش کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے گوشت میں پتھر کی سی لوچ پیدا کی۔

رنگ کی ان لہروں میں میرا دل، جو پہلے امیرا کدل پل کے نیچے سے گذرنے والا خاموش اور بے رنگ جہلم تھا، اب اچھلنے لگا ہے کیا کشمیر کی سب ہی عورتیں ایک سی خوبصورت ہیں۔ نہیں تو۔ نہ سبھی ایک سی ناک ہے ایک سی لطیف اور نہ بدماتی ہیں۔ رنگ الگ بات ہے۔ روپ الگ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ٹھیکیدار للکار رہا ہے "جلدی ہاتھ ہلاؤ جلدی"

لڑکیاں خوشی خوشی پھول چن رہی ہیں۔ پہلے ٹھیکیدار کی کوک سن کر سہم جاتی ہیں۔ لیکن پھر باتوں کا وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے ماضی، حال اور مستقبل کا سارا تحیّن اس کھیت میں جمع ہو گیا ہے۔ یہ گوری گوری اگر دنیں۔ کالی کالی آنکھیں۔ کالی بدلیوں سی جن میں بجلی چمکتی رہی ہو۔ ہونٹ کانگ کے شہد سے کہیں زیادہ رسیلے اور چمکیلے۔ باتیں کرتی ہیں تو ہونٹوں کے کونے ہلتے ہیں اور میرے دل پر رنگین پھوار پڑتی ہے۔

چند بوڑھی عورتیں بھی پھول چن رہی ہیں۔ سال بہ سال کیسر چنتے چنتے ان کی جوانی بیت گئی۔ جب وہ دلہنیں بنی ادھر آنکلی تھیں تب بھی یہ کھیت اسی طرح کیسر پیدا کرتے تھے۔

وہ سُرخ پھرن والی نوجوان عورت، جو کسی بچے کی ماں بننے والی ہے پھول چنتے چنتے تھک جاتی ہے۔ جیسے لالہ کی ٹہنی بارش کے بوجھ سے جھک جائے۔

میری نگاہ گھوم پھر کر اس بن بیاہی الھڑ لڑکی پر آ ٹھہرتی ہے جس نے سبز اودی پھرن پہن رکھی ہے اس کی نرگسی آنکھوں میں حیا ہے اجھجک ہے اور کچھ کچھ ڈر بھی۔ اس کے چہرے پر بچپنے کی شریر لالی سنجیدگی کی طرف پہلا قدم اٹھا رہی ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ دیکھنے میں تو کچھ برائی نہیں اور اگر اس میں کچھ برائی ہے تو میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کشمیری سے کسی اجنبی کی طرف دیکھنا جھکا لینا کیا کم بے انصافی ہے۔ اس کے بازوؤں کی تراش دیکھوں یا اس کی پتلی پتلی انگلیاں!

ٹھیکیدار کے بول ڈانٹ رہے ہیں جھڑک رہے ہیں۔ اور جب وہ لال پیلا ہو کر کہہ اٹھتا ہے "او، پھرتی سے ——— اور پھرتی سے ———" تو ہر ایک کا چہرہ پیلا پھر جاتا ہے، بوڑھی عورتوں کا بھی۔

پھولوں کی پتیاں بنفشی رنگ کی ہیں۔ ہر ایک پھول میں چھ چھ رنگ ہیں تین زرد اور تین نارنجی۔ پھول چننے کے بعد انھیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالی دیا جائے گا۔ اور پھر نارنجی تار، جو اصل کیسر ہے، الگ کیے جائیں گے زرد تار پھینک دیے جائیں۔ مگر یا تو وہ یونہی کیسر میں مل جائیں گے، یا جان بوجھ کر اس کا وزن بڑھانے کے لیے ملا دیے جائیں گے۔

پچھلے ہفتے جب میں اپنی بیوی اور بیٹی سمیت چاندنی رات میں کیسر کے پھول دیکھنے آیا تھا۔ کیسر کے تار سونے کی طرح چمک رہے تھے کبھی میں اوپر آسمان پر تاروں کو دیکھتا رہا اور کبھی کیسر کے تاروں کو۔

میرے ذہن میں ایک خوبصورت تصویر بن گئی ہے۔ اس سبز پھرن والی الھڑ لڑکی نے پھر ایک بار میری طرف دیکھ لیا ہے۔

سات سال پہلے بھی میں کشمیر آیا تھا۔ جو تصویر اس وقت میرے ذہن میں خود بخود بن گئی تھی وہ بھی تو قائم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں کیسر کا کھیت موجود نہیں۔ اور یہ کمی اس وقت پوری ہو رہی ہے ——

کیسر چنتی چنتی کنواریاں ایکا ایکی ایک گیت مل کر گانے لگی ہیں، جسے سن کر ٹھیکیدار کے گلے میں بھی سُر خرخرانے لگے ہیں۔

یار گئے پامپور وتے
کنگ پوش ورٹ نال متے
سوہنے تے بھیس پتے
یار ملیا ہیو بوتم زار!

میرا محبوب پامپور کی طرف چلا گیا! (اور وہاں) کیسر کے پھول اس سے ہم آغوش ہو گئے۔ (آہ، وہ وہاں ہے اور میں یہاں۔ اوخدا! میری آرزو

لہ کشمیری عورت کی پوشش۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سن۔

وہ سبز پیرن والی شرمیلی لڑکی بڑی ہو کر شاید اس گیت میں اپنی زندگی کا کوئی تلخ تجربہ یا ہوا رنگ اپنانے کی کوشش کرے گی۔

یہ اونچی نیچی زمین ہے کچھ جہلم کے کنارے کنارے اور کچھ دور ہٹتی چلی گئی ہے۔ کتنے ہی چھوٹے چھوٹے الگ تھلگ ٹیلے سے نظر آ رہے ہیں۔

میں ٹھیکیدار سے پوچھتا ہوں "ان ٹیلوں کو ادھر کیا کہتے ہیں؟"

وہ جواب دیتا ہے "وڈر یا کریو!"

ٹھیکیدار کا چہرہ جس پر گہری جھریاں نظر آ رہی تھیں، اور بھی سنجیدہ ہو گیا ہے۔ گویا وہ بھی ایک ضروری آدمی ہے اور جیسے اس سوال کا جواب وہی دے سکتا ہے۔

اس نے مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا ہے۔ وہ مجھے بتا رہا ہے کہ یہ وڈر یا کریو سب کے سب بارانی زمین کے ٹکڑے ہیں۔ مگر ہیں بڑے زرخیز۔

"تو کیا ان سبھی وڈروں میں کیسر پیدا ہوتا ہے؟"

"نہیں تو، کیسر تو پانچ کے وڈروں ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس بارہ ہزار بیگہ زمین پر خدا کا بڑا فضل ہے..... یہاں مٹی کیسر پیدا کرتی ہے۔"

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ زمین مہاراجہ کی ذاتی ملکیت ہے۔ اور جو بھی اسے ٹھیکہ پر لیتا ہے اس کا آدھا کیسر اپنے ماتحت کھیتی کرنے والوں میں بانٹ دیتا ہے اور آدھا خود لے لیتا ہے جس میں سے اسے ٹھیکہ کا روپیہ چکانا ہوتا ہے۔

"آدھی چھٹانک کیسر تیار کرنے کے لیے چار ہزار تین سو بار پھول چنے جاتے ہیں۔" وہ بڑے فخر سے کہہ رہا ہے جیسے اس کے باپ دادا ہمیشہ کیسر کا ٹھیکہ لیتے رہے ہیں۔ اور اس کی جہاں دیدہ آنکھیں، جن میں کچھ خود بینی بھی جھلکتی ہے مست ہوا لگتی ہیں۔ جیسے اس نے کیسر کا یہ راز مجھے بتا کر کبھی نہ کبھی کیسر کا ٹھیکہ لینے کے لیے اکسا دیا ہے۔

کیسر سے مجھے پیار ہو گیا ہے۔ میں اسے سب جگہ دیکھنا چاہتا ہوں ہندوستان کے نقشے پر میں ہر جگہ کیسر چھڑک دینا چاہتا ہوں۔

"مبارک ہے وہ دھرتی جہاں کیسر نے جنم لیا ہے!" یہ کہتے ہوئے کل ایک دوکاندار نے میرے لیے پانچ روپے کا کیسر تول دیا تھا جیب سے روپے نکالتا ہوا سوچ رہا تھا کہ کون جانے میری نگر کے اس دوکان دار کی بیوی کا نام کیسر ہو۔ اور وہ رات کو گھر آ کر اس کے سامنے بھی کہہ اٹھے

"مبارک ہے وہ دھرتی جہاں کیسر نے جنم لیا" اور وہ عورت یہ سمجھے کہ اس کے حسن کی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے خاوند نے ایک خانہ بدوش ادیب کے پاس تھوڑا کیسر بیچ کر ایک آدھ روپیہ کمایا ہے۔

میرے ذہن کی ساری شعریت سمٹ سمٹا کر کیسر کے اردگرد گھومنے لگی ہے۔ میری بیوی نے کیسری ساری پہن رکھی ہے۔ ہاں ہاں، بچا دیکھو میری بیٹی نے بھی کیسری فراک پہن لیا ہے اور میں خوش ہوں۔

کاش اس شرمیلی لڑکی نے کیسر کے کھیت میں کیسری چادر اوڑھا ہوتا تب اس کا گورا رنگ ایک سنہری جھلک لے اٹھتا وہ بچی اور بھی سندر دکھائی دیتی۔ اور میں سوچتا تھا وہ کیسر کے کھیت کی بیٹی ہے..... ہر کیسر کی بیٹی ہے

شام کی کیسری بشاشت دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس نے میرے دل کی زبان کو سمجھ لیا ہے۔ یہ یہ رنگ تو اسے ہمیشہ سے پیارا ہے۔ نت نئے میں کھو رہی اشاکے چاؤ۔ اور وہ سب رنگین جذبات جو ہمیشہ سے شاعروں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور اوپروں سے ہولی کیلئے آتے ہیں۔

کیا کبھی اُشا کی طرف دیکھ کر اس شرمیلی الھڑ لڑکی کو یہ خیال نہیں آیا۔ کہ اس کی طرح وہ بھی کیسری پھرن پہن لے؟ یا کیا وہ ہر روز دن چڑھے جاگتی ہے؟ اُشا کو نہ سہی۔ کیسر چھنتی چھنتی کیسر کے تار تو وہ دیکھتی ہی ہے اور انھیں دیکھ کر کھوسی جاتی ہوگی۔ یہیں سے وہ کیسری پھرن کا خیال بڑی آسانی سے لے سکتی تھی۔ پر کون بتائے اسے کہ وہ سفید اونی پھرن جسے اس نے نہایت شوق سے سلوایا ہے یا سلوانا ہے، ضرور کیسر ہی رنگائے۔

پامپور سری نگر سے بہت دور نہیں۔ تانگہ جاتا ہے۔ مگر جو مزہ پیدل جانے میں ہے وہ تانگہ میں کہاں؟ میں کئی بار پامپور آیا ہوں اور کیسر کے پھولوں سے کہیں زیادہ وہ الھڑ لڑکی ہی مجھے اس کشش کا موجب معلوم ہوتی ہے۔

ہر بار وہی سبز پھرن..... سبز پھرن! کیا اس کے پاس صرف یہی ایک پھرن ہے۔ اتنی غریبی اجی چاہتا ہے اپنی بیوی کو تب تک نئی ساری نہ لے کر دوں جب تک اس کی سب ساریاں پھٹ نہیں جائیں۔ اس الھڑ لڑکی میں کیا کچھ کم جان ہے؟ اس کا دل یا کسی الگ تھی کا ہے۔

بہت کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح یہ الھڑ لڑکی میرے دل سے نکل جائے۔ مگر اس کے باوجود وہ میرے دل میں سما رہی ہے۔ کئی بار تو میں نے سپنے میں بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ مجھے کیوں نہیں چھوڑتی۔ وہ کیوں گھورتی ہے؟ کیوں کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے..... میں کیا جانتا تھا کہ جذبات اتنے اچھل پڑیں گے۔ جیسے وہ کہتی ہو ــــ سبز پھرن سے اتنی نفرت کیوں؟ گھاس بھی تو سبز ہوتی ہے۔ بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ تم بھی سبز کپڑے پہنو۔ درخت بھی تو سبز روشنائے اوڑھتے ہیں..... پر تم نہ مانو گے..... اچھا میں ہی مان جاؤں گی۔ میں کیسری پہن لیتی ہوں..... کیا تم نے

پوچھ لیا تھا کہ میرے پاس کیسری پھرن نہیں ہے؟ واہ! خوب سوچا تم نے پچھلے سال میں نے کیسری پھرن بنوایا تھا پر یہ نہ جانتی تھی کہ ایک بنجارہ آئے گا۔ اور اسے پہننے کی فرمائش کرے گا۔ میری طرف دیکھو..... دیکھو..... دیکھو تو..... میں نے کیسری پھرن پہن لیا ہے میں کیسر کے کھیت کی بیٹی ہوں..... یا پھر کیسر کی دیوی ہوں۔

کل بھی دن بھر اسی کوشش میں۔ ہا کہ کسی طرح یہ لڑکی میرے دل میں نہ آنے پائے۔ ایک مضمون لکھنے بیٹھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ کیسر کی دیوی مجھے کہہ رہی ہے ــــ کس پر لکھو گے؟ اس کیسر کے کھیت پر جہاں تم نے مجھے پہلے پہل دیکھا تھا۔ یا اس ٹھکیدار پر جس نے تمہیں اپنے قریب بڑے ادب سے چا۔ پانی پر جھالیا تھا۔

جب میں نہانے لگا تو میرے ذہن کی کسی نامعلوم گہرائی سے کیسر کی دیوی کی آواز بلند ہوئی۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے کیا؟ میں جانتی ہوں تم ٹھنڈے پانی سے نہانا پسند نہیں کرتے۔ مجھ سے کیوں نہ کہا میں کیا انکار کر دیتی؟ میں جھٹ آگ سلگا کر جھٹ پانی گرم کر دیتی۔ صابن ہے؟ نہ ہے تو۔ اچھا نہا لو میں جاتی ہوں۔ نہا کر غسل خانہ سے نکلا تو میرا چہرہ اداس تھا۔ بیوی نے پوچھا کیا بات ہے؟ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی دیتے ہو! مگر میں نے ہنس کر بات آئی گئی کر دی۔ آخر اس سے کیا کہتا۔ میں اندر ہی اندر گھلا جا رہا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ میں کیسر کے کھیت میں گیا ہی کیوں۔

اور جب میں سیر کرنے کے لیے بے رنگ جہلم کے کنارے ہو لیا تب بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ کیسر کی دیوی میرا پیچھا کر رہی ہے۔ ایک پردل والا رنگ ہے جو اڑتا چلا آ رہا ہے۔ یہ رنگ اپنی جگہ پر چپاں ہو گیا۔ اور تصور بول اٹھی۔ ــــ واسی کا کیا قصور ہے؟ یوں دل ہٹا لینا تھا تو مجھے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہ بلایا ہوتا میرا سوتا پیار نہ جگایا ہوتا! یہ کہاں کی ریت ہے جی! کھیت کی مینڈھ کے پاس کھڑے ہو کر کیوں ٹکٹکی لگا کر تم میری طرف دیکھتے رہے تھے؟ تم مجھ سے کچھ نہ بولے تھے پر تمہاری آنکھیں تو بولی تھیں؟ تب انھیں کیوں نہ سمجھا یا تم نے؟..... ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تم تو پورے سات بار پامپور کے کھیتوں میں آنکلے اور وہ بھی پیدل! جب میں یہ جان گئی تو تم سے پیار کرنے لگی۔

میں پریشان سا ہو گیا۔ کچھ بول بھی تو نہ سکا۔ آخر کیا کہتا۔ قصور وار تو تھا ہی۔ اس کی باتوں کا میں نے بُرا نہیں مانا۔ مگر میں اس کا سواگت نہ کر سکتا تھا میں چاہتا تھا وہ مجھے چھوڑ دے۔ مجھے معاف کر دے۔ اور جب اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں ڈرے ہوئے ہرن کی طرح رک کر کھڑا ہو گیا پہلے تو میں نے سوچا کہ اس سے صاف کہہ دوں "کیسا پیار؟ کیسا آنند!" مگر میں کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کے بجائے میں نے کہا۔ کیسر کی دیوی رو نہیں! رونے سے کیا حاصل؟ دنیا کو دیکھ، دنیا کی وسعتوں کو دیکھ۔ دور نہیں تو پامپور ہی کو دیکھ آنسو بھرو آنکھیں دیکھتی تو ہیں پر ایک دھندلی سی ہن چادر کے بیچ میں سے۔ زندگی اور نگاہوں کے بیچ آنسو نہ ہونے چاہئیں کہ یوں رنگ اپنی اصلیت کھو دیتے ہیں۔..... اور تیری زندگی نوازنے والی ابابیل ہے..... کیا آنسو تیرے پنکھ بھاری نہ کریں گے؟ تجھے تیرا پریمی مل جائے گا ایک دن۔ پر مجھے چھوڑ دے۔ معاف کر دے!" وہ نہ مانی۔ برابر روتی رہی۔ نہ میں کیسر کے کھیت گیا ہوتا نہ یہ مصیبت آ کھڑی ہوتی۔

میں بازار میں جا کر پریشان خیال تب بھی تھا۔ اب یہ احساس بھی تھا کہ اکیلا ہوں۔ اچھا ہی ہوا۔ پاؤں کی جکڑ ہلکی معلوم ہو رہی تھی۔ بازار تو کسی کی ملکیت نہیں۔ میں آزاد تھا۔

پھر یوں ہی میری نگاہ چھت کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے ایسا

معلوم ہوا کہ میرے ذہن سے رنگ کا ایک ٹکڑا الگ کر سامنے کھڑکی میں ٹھہر گیا ہے۔ میرے پاؤں رُک گئے۔ کتنا ہوا چہرہ تھا۔ مشرخ گال — جیسے وہ اُبلے طاقوں میں دیئے جل رہے ہوں..... اور آنکھیں! — دو اندھیری راتیں، جن میں مجھے ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔

لاکھ کوشش کرنے پر بھی دل ہٹتا نہیں۔ الجھا ہوا رہتا ہوں۔ اپنے سر کے بالوں کی طرح راہ چلتے ٹوٹتا ہوں۔ پہلے پامپور کی دیوی تھی۔ وہ میرے ذہن کا کیسری خیال۔ اب یہ عورت تھی۔ جو کھڑکی میں یوں بیٹھی تھی۔ جیسے فریم میں تصویر جڑ دی گئی ہے۔ وہ میری طرف کس طرح دیکھتی رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں ایک ٹھنک سی محسوس کی تھی۔ جیسے کوئی نادان بچہ کسی خوش رنگ تصویر کو بوچ لے — وہ قصوروار تھی؟ — نہیں وہ بے قصور تھی — پھر قصور کس کا تھا؟ تو کیا یہ میرا قصور تھا؟

کل میں نے پھر دور سے اسے دیکھا۔ وہ فاختہ کی طرح مجھے دیکھتی رہی گردن گھمانے پر میں نے محسوس کیا کہ وہ کالی مدھ ماتی آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ وہ اندھیری راتیں میری زندگی کے اُجالے میں جل رہی تھیں میں نے اپنی بیوی کی بنا دی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔

دل مانتا نہیں۔ اس کے بھید میں خود نہیں سمجھتا۔

دل دریا سمندروں ڈونگھا۔

کون دلاں دیاں جانے؟

دے چھوچے بیڑی

دے وچ مہانے

دل بھی ایک دریا ہے، سمندر سے کہیں گہرا۔ کون جان سکتا ہے دل کی تہ میں کیا چھپا ہے۔ کیا کشتی اور کیا ملاح (بھی) ڈوب جاتے ہیں!)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیا پنجاب کے اس کسان کو بھی میری طرح ایسی الجھن میں پھنسنا پڑا تھا

اب جو اس چھت کی طرف دیکھتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس پامپور کی دیوی ہی نے یہ روپ دھارن کیا ہے۔ مگر اس کی پھرن تو سبز تھا اور اس کو لاجوردی پسند ہے۔ وہ کیسری پھرن کیوں نہیں پہن لیتی۔ مگر ہر پھول کو اپنا رنگ پسند ہے۔ جیسے ہر پھول کو اپنا گانا۔

مجھے یاد ہے بچپن میں ایک بار میں نے لاجوردی کوٹ سلوایا تھا بڑا تو نہ لگتا تھا۔ ماں کہا کرتی تھی ہر رنگ نئی ہی خوشی دیتا ہے۔ بیٹا! اگر اس کو یہ بات معلوم ہو جائے تو جھٹ کہہ دے ـــ یہ لاجوردی پھرن تمہیں پسند نہیں۔ وہ دن یاد نہیں جب لاجوردی کوٹ پہن کر اسکول جایا کرتے تھے اور یہ بھی تمیز نہ تھی کہ لاجوردی لڑکوں کو زیب دیتا ہے یا لڑکیوں کو۔

اس کی آنکھیں کتنی لاج بھری ہیں۔ یہ لاج نہ ہوتی تو وہ کتنی اوچھی معلوم ہوتی۔ اتنی لاج بھی تو اچھی نہیں کہ دل کا راز ہی دل میں رہ جائے۔ میں اس کی طرف کیوں دیکھتا ہوں؟ میرے دل کی دھڑکن تیز کیوں ہوتی ہے۔

وہ کیسے بنی اس کھڑکی کی کہانی؟ کس نے اسے اس بھڑکیلے فریم میں جڑا۔ کس سے پوچھوں؟ کون سنائے اس کی کہانی؟ اسے اس محور کے گرد گھومنے پر کس نے آمادہ کیا؟ قصور کسی کا بھی ہو، وہ خود بے قصور ہے میں اسے دور سے دیکھتا ہوں۔ دیکھنے میں تو کچھ برائی نہیں اور مجھے اس نفرت بھی تو نہیں۔

اس کالی آنکھوں والی کے چہرے پر کبھی کبھی ہنسی دوڑ جاتی ہے۔ جیسے اندھیری رات کے کالے کالے بادلوں میں بجلی گوٹے کی بے شمار دھاریں ٹانک دے۔ میرا دل اندر ہی اندر سکڑ رہا ہے۔ سوچتا ہوں وہ روتی بھی

ہوگی تو کیسا سا برس جاتا ہوگا!

کیا اسے اس ہری ہری گھاس کی یاد نہیں آتی جو مخمل کی طرح اس کے پاؤں تلے بچھی رہتی ہوگی؟ گھاس کی سوندی سوندی خوشبو جس نے پھولوں کی مہک کے علاوہ ہزار بار اسے رجھایا ہوگا۔ وہ بھولی تو نہ ہوگی۔ وہ ضرور کسی غریب کسان کے گھر میں پیدا ہوئی ہے۔ اس مٹیالے گھر کے ساتھ اس کا چہرہ بہت پرانا معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بات تو میں بلا کسی تصدیق کے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی بیسوا کی بیٹی ہرگز نہیں۔ ورنہ وہ اتنی اقمر نظر نہ آتی اور اس کی لاج میں تو کیت لہلہاتے ہیں۔

لیکن وہ کچھ گاتی کیوں نہیں؟ گانا تو جانتی ہوگی۔ ضروری نہیں کہ بنسری کسی کے منہ لگانے ہی پر بجے ..... ہوا بھی تو سُر جگایا کرتی ہے۔ سُر نیند میں کھو جاتے نہیں ہوتے۔ ان کی نیند بڑی ہلکی ہوتی ہے۔ کبھی نہ کبھی ضرور اس کے ہونٹوں میں سُر جاگ پڑے ہوں گے۔ ڈر کر ہی سہی ـــ چنانچہ اب آنکھیں کھلی ہیں۔ میرے کان بھی اس کے کوٹھے کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ آنکھوں سے کہیں زیادہ کانوں کو بے قراری ہے۔ کاش! میں کبھی دور سے اس کا پھڑپھڑاتا نغمہ سن پاؤں۔ میں سوچتا ہوں۔ کان برابر ادھر متوجہ رہتے ہیں۔ آنکھوں میں رنگین غبار سا چھا جاتا ہے۔ جب لالٹین لوگ رات موسیقی سے شرابور ہو جائے گی۔ اور سب تفکرات جو دن بھر ہمیں ستاتے رہتے ہیں۔ غریبوں کی اپنا ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر خاموشی سے چلتے بنیں گے۔

گاؤں کے خود رو گیت کبھی تو اس لڑکی کی زبان پر آتے ہی ہونگے؟

کیسے بناؤں ہمراز؟ ڈرتا ہوں کہ سماج کا ہاتھ بڑھ کر ان تمام پیالیوں کو اپنے خلاف میں نہ انڈیل لے جن میں میں نے بڑے چاؤ سے کئی رنگ گھولے ہیں۔ اگر یہ ڈر نہ لگا ہی رہے گا۔ لاکھ سوچتا ہوں ڈر بیکار ہے ..... مذہب کا ڈر...

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خدا کا ڈر ..... سماج کا ڈر ..... یہ تمام ڈر چھپا ہی نہیں چھوڑتے
وہ اخلاق کیا جو صرف ڈر پر مبنی ہو۔ وہ اخلاق کیا جو نفرت سکھائے پیار
سکھاتے نہیں، اب میں نہیں ڈرتا۔

کل رات میں اپنی تمام جرأت کو جمع کر کے اس کے ہاں چلا گیا۔ پھٹی پھٹی
آنکھوں سے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ میرے استقبال کے لیے اٹھی
بڑی عزت سے اس نے مجھے سیاہ کشمیری کمبل پر بٹھا دیا۔

"پامپور کی دیوی!" اپنے ذہن میں اس سے مخاطب ہوا۔ اور میرے ہونٹوں
پر یہ الفاظ آئے "تمہارا نام کیا ہے؟"

شہد بھرے لہجہ میں اس نے جواب دیا "کنگ پوش!"

اور میں نے دیکھا کہ ایک زعفرانی حیا اس کے گالوں پر پھوٹنے لگی ہے۔

"کنگ پوش!" میں نے پوچھا "کنگ پوش کے کیا معنی ہیں؟"

"کنگ پوش یعنی کیسر کا پھول"

اور اسے ایسی جگہ دیکھ کر مجھے فوراً خیال آیا "اور سب پھول بہار میں
کھلتے ہیں اور کیسر خزاں میں کھلتا ہے"

میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں میں وہی گیت گونج رہا ہے جو کہ میں
نے پامپور میں سنا تھا:

یار گومے پامپور وتے
کنگ پوشور ٹ نال متے
سوچم تتے بچس یتے
بار صا تیبو بوجتم زار

میں سوچنے لگا کہ یہی خیال پیچھے میری بیوی کو نہ آرہا ہو "میرا محبوب اس
کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں کیسر کے پھول اس سے ہم آغوش ہو گئے۔ وہ اس
ہے اور میں یہاں۔ او خدا۔ میری آرزو سن!"

کنگ پوش بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے مسرت کی لال لال
دھاریاں ایک جال بُن رہی تھیں۔ رات کو پہلا آدمی اس کے یہاں آیا تھا۔ اس
نے سوچا ہوگا کہ میں اسے روپیہ ہی نہ دوں گا بلکہ چُغہ، کا ایک سبز پتہ بھی دونگا
جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں نے اسے اپنی محبت بھی دی دی۔

اور پھر کنگ پوش لکڑی کے بنے ہوئے ٹرے پر الائچی اور بادام کی
گریاں رکھ کر لے آئی۔ میں نے ایک گری اٹھا لی۔

"شکریہ!"

"الائچی نہ لوگے؟"

"الائچی تو میں کھا چکا ہوں"

کانگڑی میں کوئلے دہک رہے تھے ـــــ اس کے گالوں کی طرح!
کنگ پوش نے کانگڑی میری طرف سرکا دی۔

"شکریہ"

کتنے قریب تھے اس کے گال ـــــ کیسر اور اوشا کی لالی سے کہیں
گہرے کالے ریشمی بال ـــــ راتوں کے ان گنت سائے چھپائے
ہوئے۔

کنگ پوش اتھڑ تو نہ تھی ـــ ہاں، شرمیلی ضرور تھی بجلی کی روشنی میں اس کا
ہندوستانی پہرن اسے زیب دے رہا تھا۔

بالا خانہ کی زبان چند رسمی فقروں تک محدود رہتی ہے۔ میں اس سے
واقف نہ تھا۔ شکوہ، شکریہ اور احسان کے جھٹ پٹ بدلتے رنگ میں کنگ
پوش کی آنکھوں میں کیسے دیکھتا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ قہقہہ کیسے لگاتا۔
ایسا قہقہہ جو کسی پہاڑی چشمے کی آواز پیدا کرتا۔

کنگ پوش نے لکڑی کا بنا ہوا خانہ کا پتہ جس پر الائچی اور بادام کی گریاں بدستور
پڑی تھیں میری طرف بڑھایا اور بوسہ میں نے خاموشی سے ایک الائچی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اٹھا کر منہ میں ڈالی۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ سچ مچ وہ کیسر کا پھول تھی۔

میں مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی۔ میں شاید ایک ناگ رائے تھا اور وہ ایک پیمال۔ اور شاید کشمیر کی پرانی پریم کہانی ایک بار پھر دوہرائی جانے والی تھی مگر میں نے سنبھل کر کہا "میں تو گیت جمع کیا کرتا ہوں۔"

"گیت؟ کیسے گیت؟"

"گاؤں کے گیت۔"

"گیت! گیت!" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی دولہن کا بھڑکیلا لباس میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہو گیا ہے۔

اس نے اپنا تھکا ہوا بازو اٹھایا اور کانپتی انگلی سے سامنے کے مکان کی طرف اشارہ کیا جہاں گھنگرو بج رہے تھے اور روشنی جھلملا رہی تھی "جاؤ اس طرف چلے جاؤ۔ ادھر گیت بھی بکتے ہیں اور..... اور....."

اس کے لہجے میں کھیتوں کی گنگناہٹ تھی اور میں ان کھیتوں کی طرف جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، جہاں مٹی کیسر پیدا کرتی ہے۔

اور سب پھول بہار میں کھلتے ہیں مگر کیسر خزاں میں کھلتا ہے۔

کیا یہ دھرتی کبھی اتنی بانجھ ہو جائے گی کہ کیسر اگنا بند ہو جائے؟

راجندر سنگھ بیدی

دس منٹ بارش میں

.....ابوبکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی کشادہ راستہ کسی کوئلہ کی کان میں جا رہا ہے۔ سخت بارش میں دو ونٹا کی باڑہ، سفر نیا کا گلاب، قطب سید حسین مکی کے شریف کے کمنڈ میں ایک کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی جس کی پشت نم آلود ہو کر سیاہ ساٹن کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ سب بھیگ رہے ہیں۔ اور راٹا بھیگ رہی ہے۔

راٹا کون ہے؟ اسے کلپ برکش کہہ لو یا کام دھین گائے۔ یا اس سے بہتر راٹا ——— راٹا ہے۔ پھرایا لال کی بیوی۔ ایک دس سالہ کابل جابل۔ نا اہل چھوکرے کی ماں۔ چند ماہ ہوئے تخفیف کے موقع پر میوم پائپ کمپنی والوں نے پھرایا لال کو کام سے الگ کر دیا اس وقت سے اس کی پرسکون زندگی میں قسمت کے طوفان گرد باد پیدا ہونے لگے۔ تلاش معاش میں نہ جانے وہ کہاں چل دیا۔ سنا ہے کہ وہ راٹا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا ہے۔

محمد یونس بٹ
50 مکان نمبر 15 سٹریٹ نمبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اور جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو، وہ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے ..... مرچو تیزابی کا بیان ہے کہ پوہ کے ایک سرد نیلے سے دھندلکے میں اسی نے پھرایا لال کو اپنی ہی برادری کی ایک عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ وہی عورت ـــــ کوڑی جو ابوبکر روڈ کے مکانوں میں سے گیلے اٹھایا کرتی تھی۔ ان دنوں پھرایا لال بیکار تھا بیکار انسان کے عقل و فکر میں خون جگر پینے یا کثرت سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سماتا۔ بعضوں نے پھرایا کو کوٹ پتلی میں صفیں بناتے ہوئے دیکھا قریب ہی کوڑی ایک غیر آدمی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ راٹا پھر بھی پھرایا لال کو دل سے چاہتی ہے۔ یہ محبت اور جنون کے انداز کبھی چھٹتے ہیں؟..... اور راٹا بھیگ رہی ہے۔

راٹا کی مشکی گھوڑی ابوبکر روڈ پر ہماری کوٹھی کے سامنے گھوم رہی ہے وہ اس کا شب دیجور کا سا رنگ ..... صرف اس کے ہنہنانے اور کبھی کبھی بجلی کے کوندنے سے اس کے وجود کا علم ہوتا ہے صبح سے بیچاری کو دانہ نہیں دیا گیا۔ رہی اس کی سوچ والی ٹانگ پر ہلدی لگائی گئی ہے۔ بھوک کی شدت سے بے بس اور بگڑ کر وہ آوارہ ہو رہی ہے۔ شاید پھرایا کو ڈھونڈ رہی ہوگی۔ پھرایا ـــــ جو اسے ابھی چھوڑ کر کوڑی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ کوڑی ـــــ جو کوٹ پتلی میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ ایک وقت میں ایک دل کے اندر مشکی گھوڑی رہ سکتی ہے یا کوڑی یا کوڑی راٹا ..... اور بھوکی گھوڑی ہنہناتی ہے جیسے کبھی سکندر سے جدا ہو کر پوس فیلس ہنہناتا تھا۔

راٹا اپنے سر سے بوریے کی اوڑھنی اٹھا کر پوچھتی ہے۔

"بابو جی ـــــ آپ نے یہاں رامی نہیں دیکھی؟ ..... رامی میری مشکی گھوڑی؟"

میں نے کہا "رامی! کون رامی؟ ..... اچھا رامی تمہاری رامی مشکی گھوڑی۔ ارے او وہ رونٹا کی باڑھ کے پیچھے ٹوکھڑی ہے۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتی کیا؟"

راٹا آنکھوں کو سکیڑ کر باڑھ کی طرف دیکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ جب کھلتے ہوئے رنگ کی مشکی گھوڑی شام کے وقت بارش بھیگ جاتی ہے تو وہ بھی شب دیجور کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ اور بے نور، رو رو کر جوت گنوائی آنکھوں کو اس سے تاریکی شام یا شام تاریکی سے جدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے.....

..... بارش کی رم جھم، مسرس کی لمبی لمبی سہیلیوں کی کھڑکھڑ، گرتے ہوئے پتوں کے نوحے، رعد کی گرج، بجلی کی بط بط، مینڈکوں کی ٹراہٹ پرنالوں کے شور اس کتیا کی اونہہ ـــــ اونہہ جس نے ابھی ابھی سات بچوں کو جنم دیا ہے۔ اور ایک بچے کو منہ میں پکڑے کسی سوکھی نرم و گرم جگہ کی متلاشی ہے۔ ان سب کے شور و غوغا میں بھوکی گھوڑی کی جگر دوز ہنہناہٹ علیحدہ سنی جا سکتی ہے۔

پرا شر کہتا ہے "میں بھیگ رہا ہوں ..... اور وہ بھی بھیگ رہی ہے"

ماں خفا ہوتے ہوئے کہتی ہے "گیلا ..... گیلا ..... گیلا ..... تنور میں گرنے والا ہو گیا ہے۔ ابے! یہ موئی کتیا تنور میں چھپی بیٹھی ہے۔ میرا تنور گرے گا۔ یہ بے وقت کی بارشیں، رام رے! ....."

گیلے بش کا فراک گر کر صحن میں پڑا ہوا یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی مری ہوئی فاختہ ہو۔ ماں ناراض ہے کہ میں نے فراک کیوں نہیں اٹھایا۔ حالانکہ راٹا کی گھوڑی پگھلنے میں میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ ماں اس لیے بھی خفا ہے کہ میں پرا شر سے آوارہ نوجوان کے ساتھ بارش میں لنگوٹا باندھ کر نہانے کے لیے چلا ہوں۔ ماں کا خیال ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ رہ کر آوارہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوجاؤں گا حقیقت میں ماں کے ماتھے پر تیور اس لیے ہیں کہ میں نے راٹا کو
گھوڑی پکڑنے میں مدد دی ہے۔ گھوڑی کو شام کی تاریکی سے علیحدہ کرتے
اس کی ایال راٹا کے ہاتھ میں دیدی ہے اور اس فعل کے ارتکاب میں میں
سے چھو گیا ہوں۔

میں نے کہا "اسی پراشچت میں تو میں نہا رہا ہوں ماں!"

حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی آلودگی کو میں پسند کرتا ہوں۔ پر اشر
کیا وہ ہر قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہے..... کاش! سپھرا یا لال کبھی نہ
اور راٹا کو ہر کام کے لیے ہمارا مرہون منت ہونا پڑے۔ کیا وہ گھوڑی ہی
دائے گی اور کسی کام کو نہیں کہے گی؟

ماں کہتی ہے لوہار، بڑھئی، چمڑا رنگنے والے ایک برہمن کو چھوڑ کر قدم
بولنے والے اڑتالیس قدم، موٹا مانس کھانے والے چونٹھ قدم پرے رہ
کر سکتے ہیں۔ مگر میں ماں کو کہتا ہوں۔ ماں ان لوگوں کی وجہ سے تو ہم
ہیں برہمن کھیتی کی یہ لوگ باڑ ہیں..... اور پھر تھوڑی بہت برائی
کو بچانے کے لیے روز ازل سے زندہ ہے۔ ماں کہتی ہے کل جگ ہے
گھور کل جگ۔

بظاہر ماں بشن سے باتیں کرتی ہے۔ مگر دراصل اس کا مقصد سب
مجھے سنانا ہوتا ہے "مہا یگیہ برہما کا ایک دن ہے۔ کرت کرتا، دوا
لاکھ برسوں کے ہیں۔ کل جگ چار لاکھ بتیس ہزار برسوں کا ہے۔ پچھلے بر
چیت کے مہینے میں کل جگ کو صرف پانچ ہزار چھبیس برس گذرے ہیں
جانے ابھی کتنے باقی ہیں ——— اور یہ بے وقت کی بارشیں!"

"بارش نے کافی سردی پیدا کر دی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں بھائی میرے تو دانت بجنے لگے..... چلو برامدہ میں چلیں۔
ابھی بہت وقت تو نہیں ہوا"

"چائے بنوا دوں نا ——— سردی ہو رہی ہے"

"چائے بن جائے گی۔ سگریٹ نہیں ملیں گے"

"کوئی بات نہیں۔ بیڑیاں جو ہیں میری جیب میں"

"ہمارے ایگریکلچر سنڈیکیٹ کو آجکل بارش بہت فائدہ مند ہے"

"ہاں ——— چائے کے پودوں کی ڈھلوان جنوب کی طرف ہے۔ ابوبکر
روڈ کا تمام پانی ادھر نہیں جاتا۔ مگر زیادہ بوچھاڑ چائے کے پودوں کے لیے
نقصان دہ ہے۔ جڑیں گل جانے کا اندیشہ ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار کا تو کہنا ہی
کیا..... کچھ بھی ہو یہ بارش البوسی ایسوسی ایٹڈ ایگریکلچر سنڈیکیٹ کے لیے فائدہ مند
ثابت ہوگی۔ ہماری آمدنی بڑھ جائے گی۔ کیوں! ہے نا!"

"ہاں!"

"ایشور اپنی دیا بارش کے ذریعے بھیجتا ہے"

"ہاں ——— دیا..... آندھی ——— ارے! راٹا کی چھونپڑی کی چھپریل
اڑ رہی ہے"

"ایشور کی دیا....."

اب بارش بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔ گویا..... سب کی سب ابوبکر
روڈ پر ہی برس پڑے گی۔ بکٹیسر کے پتے لیٹھ کے پروں کی بھیگتے نہیں۔ پانی
کے قطرے ان پر پارے کی طرح لڑھکتے ہیں۔ کہیں کہیں اکٹھا کر ایک مدور
ہیرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور قطرہ وہیں ٹپکتا ہے
تو ہیرا زیادہ مدور اور بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر نازک نازک رات کی رانی کے پھول
اس بوچھاڑ کی تاب نہیں لا سکتے۔ ابوبکر روڈ کے دو رویہ کوٹھیوں میں لگے
والے بکٹیسر کے پتوں کی طرح ہیں۔ بارش ان کی سلیٹ کی چھتوں پر سے بہتی
لاکھی ہوئی ابوبکر روڈ پر آ رہی ہے۔ بارش کے قطرے ان کے لیے مدد
ہیرے ہیں..... مگر رات کی رانی ——— راٹا سر پھینک دیتی ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گاہے گاہے سر اٹھا کر کھپریل کو باندھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے بھیگے ہوئے بالوں کی وجہ سے دوگن ویلیا کی حسین بیل دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بیچاری ٹشکی گھوڑی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اب یہ اس کے لیے ایک نئی مصیبت ہے۔ جھونپڑی تمام چھت سے پانی بہنے لگا ہے۔ بوریئے کی اوڑھنی تو محض رسمی پناہ ہے۔ اس کے تمام کپڑے بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئے ہیں۔ شام کے اندھیرے میں جب بجلی چمکتی ہے تو وہ عریاں سی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں ایشور کی دیا سے کوئی نرم و گرم چائے زیب تن کرتا ہے کوئی عریاں ہو جاتا ہے۔ کسی کی آمدنی دوگنی ہو جاتی ہے تو کسی کی کھپریل ٹوٹ جاتی ہے۔ کوئی شب سمور گذارتا ہے کوئی شب تنور۔

دوگن ویلیا کی بیل کو جب تند ہوا ہلاتی ہے تو یوں دکھائی دیتا ہے گویا کوئی حسینہ سرد ہونے کے بعد لب بام اپنے چمکیلے سیاہ بالوں کو زور سے نچوڑ کر دونوں ہاتھوں سے چھانٹتی ہے۔ راٹا بے عقل، کاہل، پاگل لڑکا جھونپڑی میں سو پا پڑا ہے۔ بجھتے ہوئے چولھے کے پاس گرم ہو کر ــــ اگر وہ جاگتا ہوتا تو ٹشکی گھوڑی پکڑنے کے لیے اس کی ماں کو میرا مریون منت نہ ہونا پڑتا ..... پھرایا لال تو چلا ہی گیا ہے۔ کاش وہ کاہل لڑکا ہمیشہ کی نیند سو جائے۔

شاید راٹا کھپریل بندھوانے کے لیے ہمیں بلائے۔ اس کے بارش کی وجہ سے چپکے ہوئے کپڑے، بجلی کی چمک میں اس کا بدن کتنا خوبصورت اور سڈول دکھائی دیتا ہے۔ لیکن آں ..... ماں کہتی ہے کل جگ ہے۔ ــــ کلکتہ کی مارکیٹ میں چائے کتنی بکے گی؟ کتنی دساور کو جائیگی۔ میری آمدنی بڑھ جائے گی پراشر کی بھی۔ لیکن وہ کمبخت بیڑیاں پیے گا۔ چائے کے پیالوں کے پیالے اور شراب اور .....

مرتجھے نکلے گلٹی۔ ہیضے کے توڑے ..... سوئے کا سویا رہ جائے تو ..... راٹا اپنے چھوکرے کو گالیاں دیتی ہے۔

راٹا کو چائے کی ضرورت نہیں۔ گالیاں دیتے ہوئے اس کے جسم میں کافی گرمی آگئی ہے۔ وہ نکما، سست لڑکا، اس کے ساتھ کھپریل بھی تو نہیں بندھواتا۔ آرام سے بجھتے ہوئے چولھے کے پاس پڑ رہا ہے۔ پانی کی چھینٹیں پڑتی ہیں تو پاؤں سکیڑ لیتا ہے۔ جب اندر پانی ہی پانی ہو جائے گا تو وہ آخیر ملتا ہوا اٹھے گا۔ صرف اتنا کہے گا۔ ماں کیا بات ہے جو اتنا شور مچا رکھا ہے۔ چین سے سونے بھی نہیں دیتی ..... جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تو شاید یہ بھی کہے کہ ایسی عورت کے گھر کیوں پیدا ہوا جو ایسی ایسی گالیاں دیتی ہے جسے میری کوئی بھی ضرورت نہیں۔ کہتی ہے سوئے کا سویا کا سویا رہ جائے تو ..... وہ بیوقوف کیا جانے کہ جب ماں یہ کہتی ہے کہ سوئے کا سویا رہ جائے تو اس وقت وہ اسے ہمیشہ کی نیند سے بچانے کے لیے طوفان و باراں میں تن تنہا بے یار و مددگار اپنی جان تک لڑا دیتی ہے

ابھی انتہائی کرسنگی کی وجہ سے اس کی ٹشکی گھوڑی ہنہنا رہی تھی۔ جیسے سکندر سے جدا ہونے پر بوس فیلس ہنہناتا تھا۔ مگر اب وہ خاموش ہے۔ شاید اس نے راٹا کی بے بسی کو دیکھ لیا ہے اور پھرایا کے پیار کو۔ اب وہ کبھی نہیں ہنہنائے گی۔

پراشر بولا "وہ ایک مرتبہ مدد کے لیے اشارہ تو کرے"

"ہاں ــــ اور ہم دونوں" ..... میں نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں "کیوں نہ ہم خود ہی چلے جائیں"

"مگر ماں کہتی ہے۔ کل جگ کو صرف پانچ ہزار برس گذرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں!"

پھر وہی گالیاں .....

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تجھے آدے ڈھائی گھڑی کی..... نکلے تیرا جنازہ للچاتا وا..... گور میں پڑے..... خون تھوکے تو....."

شاید وہ چھوکرا سوچتا ہوگا میں کیوں اس عورت کے گھر پیدا ہوگیا جو مجھے گور میں بھیجنا چاہتی ہے۔ وہ بے وقوف کیا جانے کہ حقیقت میں وہ اسے آبی گور سے بچانے کے لیے اپنی جان تک لڑا رہی ہے۔ وہ دس سالہ بے عمل، غافل، کاہل چھوکرا اب تک اپنی جگہ سے نہیں ٹلا۔ صرف اس لیے کہ راٹا کو اس سے محبت ہے۔ میں کا اس جوانا مرگ کو ابھی طرح سے احساس ہے۔ وہی راٹا کی زندگی کا سہارا ہے۔ وہی اس کی آنکھوں کا نور ہے۔ اسی لیے تو وہ بکیں اور اندھی ہے..... اگر راٹا پھرایا لال سے محبت نہ کرتی۔ اگر اس چھوکرے پر تمام امیدیں نہ لگا دیتی تو شکھی ہو جاتی۔

ابوبکر روڈ متحرک ہو کر کوئلہ کی کان میں جاتی دکھائی دیتی ہے۔ بہاؤ کے خلاف ایک دہقان بھیگتا ہوا آہستہ آہستہ اسی جانب آ رہا ہے اس کے ہاتھ میں ایک بیل کی رسّی ہے۔ شاید وہ بیل کو کہیں سے چرا لایا ہو۔ غالباً اس کی خواہش کہ ہم اسے کچھ دیر برآمدہ میں ٹھیرنے کے لیے جگہ دیں۔ اور یہ ممکن نہیں، کون جانے بیل گوبر سے برآمدہ کا فرش خراب کر دے۔ اور ماں..... پھر چوری کے مال کو اپنے پاس رکھنا.....

"بابوجی سلام" دہقان بولا۔

"سلام" پراشر نے زیر لب کہا۔

پھر وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک گیلا کاغذ پراشر کے ہاتھ میں دیدیتا ہے ——— پروانہ راہداری..... یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بیل چوری کا نہیں، اپنا ہے۔ جسے وہ تال محل کی منڈی میں بیچنے کے لیے لے جا رہا ہے۔

باعث تحریر آنکہ

ایک راس گاؤنر، جس کے سینگ اندر کو مڑے ہوئے ہیں، دُم کے سیاہ بالوں میں سفید....."

——— اور باقی کا بارش نے دھو دیا ہے۔ کتنے بے ربط ہوتے ہیں یہ دیہاتی لوگ، پہلے سینگ اور پھر دُم، بعد المشرقین، ان کے لیے گوپا دُم اور سینگوں کے درمیان کوئی جگہ ہی نہیں۔ جسم کا رنگ پہلے آنا چاہیے تھا خلین جسم جو بارش میں گیلا ہو کر سفید ساٹن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اندھیرے میں اس کا سفید رنگ آتا ہے۔ مگر جب بجلی چمکتی ہے تو بیل بجلی کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

..... بیل تمام زور لگا کر ہانپتا ہے جیسے شوبی جی مہاراج کو دیکھ کر پیار سے اپنا ٹھنڈی گن ہانک رہا ہو۔ بیل صبح سے بھوکا ہے۔ مگر اپنے بوڑھے مکروہ شکل مالک کو پیار کیے جاتا ہے اگرچہ عقل حیوانی سے جانتا ہے کہ بوڑھا کل اسے تال محل کی منڈی میں بیچ ڈالے گا۔ ہائے یہ محبت اور جنوں کے انداز بھی کیسے چیستاں ہیں!

"کیوں بیچتے ہو اتنے خوبصورت بیل کو؟"

"بابوجی!..... فصلیں تباہ ہوگئی ہیں..... اور مالیا نہ دینا ہے..... اُف! یہ بے وقت کی بارشیں! کیا میں اندر آجاؤں اس چھت کے نیچے؟"

"اوہوں ——— تمہارا بیل گوبر سے برآمدہ کو خراب کر دے گا۔"

"میں صاف کر دوں گا بابوجی..... شیشے کی طرح..... بیل بھی سے بھوکا ہے۔ اتنی سردی کہاں برداشت کرے گا۔ اور پھر دوسری بات یہ ہیں۔ فقط یہ پروانہ راہداری دکھا گیا تو یہ مال چوری کا سمجھا جائے گا تال محل کا تھانیدار جہاں خاں بڑا کڑوا آدمی ہے۔ مار مار کر ادھ موا کر دیگا۔ بیل جاتا رہے گا۔ تال محل میں اس بیل کی قیمت پر ہی تمام امیدیں لگا رکھی ہیں..... ہائے! یہ بے وقت کی بارشیں.....

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"جاؤ" پراشر نے کہا..... "ہم تمہیں یہاں جگہ نہیں دے سکتے۔ جاؤ....."

دہقان سہم کر چلا گیا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا۔ گویا رات کو ہمارے ہاں ہی سینڈھ لگائے گا۔ اگر وہ سینڈھ لگائے بھی تو حق بجانب ہے" نے سوچتے ہوئے کہا۔

نیل ابوبکر روڈ کے چوک پر گر پڑا ہے، وہ دہقان کے اٹھائے کسی کے اٹھائے نہ اٹھے گا۔ وہ نندی گن کی طرح دہقان کو دیکھ کر کبھی نہیں لگائے گا۔

پھر میں نے پراشر سے کہا: "چائے تیار ہے بھابھی ——— کتنی پیالیاں پیو گے تم؟"

"چھ!"

"پارہ شر..... اور درجن بیڑیاں؟ کہہ دو ہاں"

"زیادہ"

"چھی!"

بارش اور بھی تیز ہو رہی ہے۔ اور راٹا کی گالیوں کی بارش بھی۔ راٹا کی کھپریل گر چکی ہے۔ دیواروں میں شگاف ہو گئے ہیں۔ قریب ایک سیٹھ کے سہ منزلہ مکان کا پرنالہ راٹا کی جھونپڑی پر گرنے لگا ہے۔ جھونپڑی کے ارد گرد ابوبکر روڈ پر چلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر طوفانِ نوح کا خیال آتا ہے۔ کیا ہم راٹا کی مدد کر سکتے ہیں۔ باوجود کل جگ کے..... ہمارے برامدے کے سوا اور کوئی نزدیک پناہ بھی تو نہیں ہے پراشر خوش ہے۔ اس کے پاس چائے ہے۔ بیڑیاں ہیں..... اور بے پناہ راٹا ادھر آ جائیگی....."

راٹا چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پراشر کہتا ہے۔

"ابھی وہ کہے گی مجھے اپنے دامن میں چھپا لو، بابو جی"

"کبھی نہیں" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے؟"

"یہ بارش کا دامن کیا اس کے لئے کم ہے؟..... راٹا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں..... جب کسی ایسے انسان پر عزت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں..... تو خود بخود اس کے لئے ایک بہت بڑا دامن کھل جاتا ہے"

اور راٹا کی مٹھیاں بند ہیں۔ کبھی کبھی وہ دانت پیستے ہوئے چیختی ہے..

"جوان مرے..... کلموئے..... میں نے تو رولیا تجھے بے چین"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رشید جہاں

نئی مصیبتیں

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچا زاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں۔

"شاید بارہ روپے پاؤنڈ تھا کیوں نہ اماں جان؟ وہ ساس کے لیے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں" صغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں بچوں کے سب جمپر اونچے ہو گئے۔ اب مسز رابرٹ کو اون لا کر دیا ہے کہ ان کے سوئٹر بُن دے۔ بڑی مشکل ہے"

"آپ کو کیا مشکل بنے گی تو بیچاری نرس ——" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور موقع پر نیبر چوٹ کیے بغیر نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ

دو سال میں دو تین جمپر یا ٹپل اوور بُن لیں اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بنتی؟" بھابی عطیہ نے چڑ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔ تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے۔ اور بقول صغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی نہ ہائشت لڑائی نہ ہو۔ اماں کو صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں "سچ تو ہے اون بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی اپنے لیے ایک جمپر کا لے آؤں گی"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آتشدان کے سامنے اپنی سفید بلی کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ ادھر بلی اونگھ رہی تھی۔ ادھر چچی اماں، لیکن نہ معلوم کس طرح صغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے بولیں۔ "اون کہاں سے؟ آجکل لڑائی کے زمانہ میں اون رہا ہی کہاں ہے جولے"

"ابھی ابھی صبح ہی تو آپ دکان سے لیکر آئی ہیں۔ اور اب کیا دن بھر میں ساری دکانیں خالی ہو گئیں" چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ رہ سکتے تھے۔

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے کب کہا تھا کہ دکانیں خالی ہو گئیں"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ اون کا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب بھی ساس کی ہمدرد نہیں۔ اور اب تو اور بھی زیادہ۔ ان کے اوپر روپے کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار گذرتا تھا اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ انہیں ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے!"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا؟ ..... صغرا کل چلنا میرے سا اور جو پسند آئے لے آنا ....."

"اے ہے ابا جان رہنے بھی دیجئے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہوگئی ہے" چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لیے تیار ہونے چلے گئے۔ اتنا سمجھ میں آیا "خیر تم مت لینا۔ مجھ کو تو اون چاہیے ..... میں خریدوں گا ....."

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں ....." لو میں کیا غلط کہا تھا کہ اون اب ناپید ہوگیا ہے" چچی اماں نے شکایت بھ لہجہ میں کہا کہ سننے والے کو ترس آجائے۔ آج ہی صبح میں، بھابی عطیہ اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپے سے زیادہ کا اون لیکر آئے تھے۔

"اون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اجڑ گئی ہے" میری اماں بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان ٹھیک ہے اب جارجٹ کے دام ہی دیکھ لیجئے پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپے گز بہت اچھی جارجٹ لی تھی۔ اب پانچ روپے گز بھی نصیب نہیں اب اس دفعہ میں نے اتنے تھ کپڑے مسوری میں بنائے، اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں"

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تو تم نے ہمارے ہی سامنے خریدی ہو اوورکوٹ ....." میں بیچ میں بولی۔

"لو وہ بھی کوئی ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ" "نوکروں کی وردیاں ہر سال سوتوا سو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو

عادت ہے اندھا دھند اٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے۔ کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سن لیں"

چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"اے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عیب ہے کہ صفائی کے نام پر ہزار دو ہزار روپیہ خرچ کر دیتے ہیں" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی بی آجکل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں" یہ چوٹ بچاری صغرا پر اس نے ..... ہماری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں ان کو برس کی عمر ہونے پر بھی بہت شوقین تھیں۔ اور باوجود بے شمار ساڑھیاں ہونے کے صبح ہی دو نئی ساڑیاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساڑھیاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آرہا تھا۔ کچھ نہ سمجھیں اور بہت بھولپن سے کہنے لگیں۔ کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشین کی قیمت تو روپے گز ہوگئی۔ ۲۷ روپے میں وہ ساڑھی ملی۔ لو بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن ہے۔ اور دوسری تو خیر سودیشی سلک تھا۔ ۱۷ روپے میں سستی ہی مل کہتی ہوں کہ آجکل تو وہ برا زمانہ آگیا ہے کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہو پہننے کا۔ بڑی مصیبت کے دن ہیں ..... اور ابھی تو دیکھو کیا ہونے والا ہے ....."

"آپ سچ کہتی ہیں اما جان" بھابی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لے کر رندھی ہوئی آواز میں کہا "یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام و چین اس کمبخت کی نذر ہوگیا ہے ....."

مسعود لائبریری
لاہور نمبر 15 - کان نمبر 50
سنگیر و بلیئر جوہانسبرگ - کراچی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا ٹھیک ہو..... پٹرول کے دام ہیں کہ باوا کے مول ا
پھر بھی ناپید، وہ تو کہو کہ تمہارے بھائی جان کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی
لکار کی موٹر پڑی تھی۔ اس جھگڑے کو پچاس روپے دے کر رجسٹر کرو
تو جا کر دو موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا سچ مچ اس لڑائی میں تو
سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے۔" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سویرے سیر
کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہو
ہے ناس ہی ہو گئی۔" میری اماں نے صاد کی۔

"ہاں یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پر پابندی سرکار نے
لگا دی اب دام دو روپے چار آنہ گیلن تھے چلو تین روپے کر
لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے دام ہوتے وہ خریدتا
کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا۔" بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا
گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پر ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پر آفت آ
ہے لو بھلا سیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے
جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا

"اور انڈے؟" چچی اماں نے کہا۔ "بارہ آنہ درجن تو ہو گئے۔ اور
بھی اب دو روپے تک ہو گئی۔ کوئی کھاتے تو کیا کھائے۔ اور تو
تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں پرونس (Prunes)
ہی نہیں، بلا سے، پچھلے مہینے میں پیس روپیہ میں سات سیر کا ٹین مل تو
اب وہ بھی نہیں..... فروٹ سلیڈ بغیر پرونس کے بچے تو چکھتے ہی

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے۔" عطیہ نے ساس کے

ہمدردی کی۔ "راشد تو برابر یہی کہتا آتا ہے کہ دادی اماں کا خانساماں بہت
ہی اچھے چیز اسٹیکس (Chees Stakes) بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں
سے بھی اچھے....."

"اے تو میں کیا کروں دولھن کو کنگ چیز (King) کو تو بد
غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میں اسلم کی دوکان پر ورلی اور کی
کہ بھئی سونے ہی کے مول زرا سا دیدو۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے
لیکن وہ کہیں ہو تو ملے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی۔" بھابی عطیہ
نے سوں سوں کر کے ایک دم سے کہا۔

اے سچ تو ہے۔ اس کم بخت واجد نے نہ تو لکڑی پوری ڈالی اور نہ ہیٹر
اب تک لگایا۔ ارجمند ذرا اس گھنٹی کا بٹن دبانا..... چار چار تو ہیٹر ہیں
اور پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کرو۔ ہوا آجکل تو کوئلہ بھی دو آنے سیر دے
ہو گیا بجلی ہی سستی رہتی ہے۔ اے لو وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"
پھر صغرا سے کہا۔ "ذرا صغرا تم جانا دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے
تمہاری جٹھانی کو سردی لگ رہی ہے۔"..... صغرا اون کو چھوڑ کر جلدی سے
اٹھیں اور ساتھ ہی میں بھی۔ "بھابی ٹھیرو۔ میں بھی آتی ہوں" کہہ کر ان کے پیچھے
بھاگی۔

دیکھو گرم کمرے میں..... جانا ٹھنڈ میں نہ جانا۔" اماں کی آواز میرے
کان میں آتی ہی رہی کہ میں اور بھابی برآمدہ ہو کر باہر آ گئے۔ باہر ہوا اتنی تیز
اور ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے آر پار ہو رہی ہو۔ بھابی نے باہر نکل کر
واجد! واجد! کہہ کر آواز دی۔ اور کوئی جواب نہ پا کر بولیں۔ "بچارا سردی
کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہوگا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھا گھنٹہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے ۔ وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں ۔ تھوڑی دور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا ۔ اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی ۔ مالن مع اپنے تین چار بچوں کے بیٹھی تھی ۔ دھوبن بھی مع اپنی فوج کے جمی ہوئی تھی ۔ واجد اور دوسرے خدمت گار بھی وہاں موجود تھے ۔ مہتر بھی ایک کونہ بیٹھا چلم پی رہا تھا ۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی " اے چھوٹی دولھن ذرا ادھر آنا "

چھوٹی دولہن ذرا جھجک کر آگے ناچنے لگیں ۔ سب مرد نوکر کھڑے ہوگئے

" کیوں کیا ہے ؟" صفرا نے پوچھا ۔

" اے دلہن ! یہ لڑائی کب تک چلے گی ؟"

" بہت دن ..... کیوں ؟"

" ہے رام ! ..... سچی ؟"

ہاں ہاں سچ ہے ۔ ابھی بہت دن چلے گی " صفرا نے لاپرواہی سے کہا ۔

" ہم لوگ کیسے جئیں گے ؟"

" پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے "

" تین سیر کا تو گیہوں ہے " ایک مزدور نوکر نے اطلاع دی ۔

" اے بیٹا سچ بتاؤ ۔ یہ بپتا کب ختم ہوگی ؟ ہمرا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا " مالن میری طرف مخاطب ہوئی ۔

" چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے !"

" دلہن تم تو ہر بات میں مجاخ کرتی ۔ سچی بتاؤ اکھبار میں کیا لکھا ہے ؟"

دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا ۔

" ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں ۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو " سب نے امید بھری نظر میری طرف پھیری ۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی

" دولہن ! تمجھا بوا کہت رہیں کہ نوکروں کی چھٹنی ہوگی ؟ کا یہ جھبک ہے ؟"

" مجھے کیا معلوم !"

واجد ہیٹر لگانے چلا گیا ۔ میں اور بھابی وہیں الاؤ پر کھڑے باتیں کرتے رہے ۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے ۔

راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑا نہیں پہنے تھی ـــــ بولیں " اوئی ارجمند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو ۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آجائے گی ..... "

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی ۔ بغیر سوچے سمجھے " اور " پر زور دیکر بولی " یہ اور کی آپ نے خوب کہی "

بھابی ہنسیں " اور نہیں تو کیا ۔ بھابی عطیہ کی جارجٹ مہنگی ہوگئی ۔ یہ کم مصیبت ہے ۔ تمہاری اماں کی ہوا خوری گئی یہ کچھ کم مصیبت ہے ۔ اور ہماری ساس بیچاری کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں ۔ نہ کوکنگ چیز ہی ملتا ہے اور نہ ..... اور اگر اس پر تمھیں نمونیا ہوگیا ؟"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سعادت حسن منٹو

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ یہاں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا "دیس لیف ـــــ ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جب کہ کھانے ہی نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھا چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے۔ اور دو تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں نپٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے، اس کے ہم وطن کے مقابلہ میں اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے

تو وہ کہہ دیا کرتی تھی "صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتی" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینی شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ کہتی "صاحب! تم ایک دم الو کا پٹھا ہے ـــــ حرامزادہ ہے، سمجھا" یہ کہتے وقت وہ لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے یہ سُنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی نہ مانتا تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتلایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے کہا "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دینگے جائے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ" چھٹے آدمی نے یہ سنکر تکرار نہ کی اور اس کے پاس ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں ..... دروازے بند کر کے اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا "لاؤ تین روپیہ دو دھ کا" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی چونی جیب میں سے نکال کر اس کو دی اور سلطانہ نے بھی پچکے سے لے لی کہ چلو جو آیا مالِ غنیمت ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ——— بیس روپے ماہوار تو اس کو سستے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نل میں غائب ہو جاتی تھی۔ اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانہ میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکتی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے یہ خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص طور سے ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی زنجیر پکڑ کر اس نے اٹھنا چاہا اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈروکونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے کہنے لگا "کیا ہوا ——— چیخ تمہاری تھی۔

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا "یہ ہوا پخانہ ہے کیا ——— بچ گئی۔ یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے میری کمر میں درد تھا۔ میں نے سوچا چلو اس کا سہارا لے لوں گی۔ پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ ایسا دھماکہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پخانہ کی باہت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گند نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لیے اس نے اس عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں انبالہ آیا۔ اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ وہ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر فرسٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بھی بنا لیا۔ دو کرسیاں خریدیں۔ اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑے ہی عرصے بعد اپنا اڈا انبالہ چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد لوگوں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گاہک بن گئے۔ اور اس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولہ کی آ[illegible] بھی بنوالیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کرلیں گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ وہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کرلیا بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی شہر کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کردیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دکانیں تھیں۔ اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ، چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کرلیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کرلی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں کوئلوں کی دکان لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر [illegible] جایا کرتی تھی۔ جہاں "ہنرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا، وہاں [illegible] دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ لوہار کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اس [illegible] کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے [illegible] کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ رات میں انوری کے پاس ہی [illegible]

وہ کان کھولتے ہی گاہک تھوڑی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ [illegible] رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا "کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رُخ ہی نہیں کیا ——— مانتی ہوں اس بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے میں نہ آئے" خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی وہ خاموش تھا۔ پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔ "میں کئی دن سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ لوگ باگ جنگ کے دھندوں میں پڑنے کی وجہ سے ادھر کا راستہ بھول گئے ——— یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔"

وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑے دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خرچ اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے کھانا پینا کپڑے لتے۔ دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہوگئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انبالہ میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالہ میں یہاں کیا دھرا ہے۔ بھی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں۔ تمہارا کام وہاں خوب چلتا تھا، چلو وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ یہ آخری کنگنی بیچ کر آؤ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی یہاں سے چل دیں گے"۔

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جان من انبالہ اب نہیں جائیں گے یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تھا ہی سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا کارساز ہے یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا"۔

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی بچے کا ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت رنج ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ کو بھی آخر کسی حیلے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلہ میں چوتھائی سے بھی کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک

کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چرخا کاتتی رہتی کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی۔ اور کبھی بالکونی میں آ کر جنگلے کے پاس کھڑی ہو جاتی۔ اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں۔ اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی۔ جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک اور ٹھک ٹھک کی صدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا۔ اور گدلے آسمان کی جانب سوئے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک عجیب شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے تھے اور ہوئے ہوئے ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو انجن کے دھکا دیکر چھوڑ دیا ہوا اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ——— نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یوں تو بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور کھڑے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ پر طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے۔ ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سٹیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے یہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اس قسم کے خیالات اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا: دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں؛ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی تھی: جانِ من ـــــ میں باہر کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں بیڑا پار ہو جائے گا؛

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی۔ جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑی کے نیچے سفید بوسکی کا کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتہ لائی تھی۔ وہ بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کیلئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک چھوٹا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش بھی حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ اداسی پر گاؤ تکیہ کو سر کے نیچے رکھے لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی۔ تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے۔ پر انجن کوئی بھی نہیں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تانک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ سے نکالنے کی خاطر جب اس نے پھر سڑک کی طرف دیکھا تو وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ اس بار اس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"کدھر سے آؤں" سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا، مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا "آپ اوپر آتے ہوئے ڈر رہے تھے" وہ آدمی یہ سنکر مسکرایا "تمہیں کیسے معلوم ہوا ——— ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا کہ یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے" وہ یہ سنکر مسکرا دیا "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے اور ٹھیر گیا۔ سبز روشنی مجھے بہت پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے" یہ کہہ کر اس نے کمرہ کا جائزہ لینا شروع کیا کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں" آدمی نے جواب دیا "نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ——— چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرہ میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل صورت کا انسان تھا۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف و شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا چنانچہ اس نے شنکر سے کہا "فرمایئے ....."

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ، بلایا تمہیں نے ہے مجھے" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں سمجھا، تو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے جایا کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینی ہی پڑتی ہے"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی۔ مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں ..... میں ..... میں کچھ بھی نہیں کرتی"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا"

سلطانہ نے بھنا کر کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ——— آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہونگے"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی؟"

"جھک مارتی ہوں"

"میں بھی جھک مارتا ہوں"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں!"

"میں حاضر ہوں۔ مگر میں جھک مارنے کے دام کبھی نہیں دیا کرتا"

"ہوش کی دوا کرو ——— یہ لنگر خانہ نہیں"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں!"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شنکر نے جواب دیا "الو کے پٹھے"

"میں بھی الو کی پٹھی نہیں"

"مگر وہ آدمی جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدارسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا "تم ہندو ہو اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو"

شنکر مسکرا دیا "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ ہندو مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ شریف آدمی بن جائیں"

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو ——— بولو رہو گے"

"اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی "تو جاؤ رستہ پکڑو"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا "میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا ——— میں بہت کام کا آدمی ہوں"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالہ میں آیا ہوتا جہاں وہ خوش حال تھی۔ تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا۔ اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ اداس رہتی تھی۔ اس لیے شنکر کی باتیں پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "پرانے قلعہ سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں"

"کچھ انھوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ——— پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے روہانسی آواز میں کہنے لگی۔ سارا سارا دن باہر غائب رہتے ——— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ نہ کہیں جا سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کیا ہو گا؟ ——— یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا۔ اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے ——— خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیف برداشت کرنے کے بعد ہم....."

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لیے کچھ کرو چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو۔ پر مجھے مشلو کا ایک کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی ایک قمیص پڑی ہوئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔ اس کو میں کالا رنگوالوں گی۔ سفید ننوں کا ایک دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے دیوالی پر مجھے لاکر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوالیا جائیگا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔۔۔۔۔۔ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لادو ——— میری بھتیجی کھا ڈاگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا۔ "اب تم خوامخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو ——— میں کہاں سے لاؤں گا ——— افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر ساڑھے چار گز کالی شلوار کا کپڑا لادو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ——— تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گز میں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے۔ اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لاتا ہوں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا۔ اور سو گئے۔ صبح ہوئی خدا بخش پرانے قلعہ والے فقیر کے پاس چلا گیا۔ سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کروٹیں بدلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا ننوں کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس نے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی تھی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنگن میں موری کے

پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔

قریباً ایک گھنٹے سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آ رہے تھے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جو اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بنا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ——— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ مشکل پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟ ———"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ——— نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں ——— یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ——— چھوڑو ان فضولیات کو کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"تم عورت ہو ـــــ کوئی ایسی بات کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے ـــــ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"جو دوسرے چاہتے ہیں" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا؟"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا "میں سمجھ گئی ہوں!"

"تو کہو کیا ارادہ ہے؟"

"تم جیتے، میں ہاری، پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو ـــــ اسی محلہ میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو لیکن ان کے یقین نہ کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ـــــ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا "میرا نام شنکر ہے ـــــ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "شنکر! میری ایک

بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا "پہلے بات تو بتاؤ؟"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: "تم کہو گے میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں، مگر....."

"کہو کہو، ـــــ رک کیوں گئی ہو؟"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا: بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے۔ اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم سن ہی چکے ہو۔ تمیں اور دو پیسے میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دیا ہے!"

شنکر نے یہ سن کر کہا "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دیدوں جو تم کالی شلوار بنا سکو؟"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا "نہیں میرا یہ مطلب ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔"

شنکر مسکرایا "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال، میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لو بس اب تو خوش ہو گئیں۔ پھر سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں ـــــ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے ہنس کر کہا "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو؟"

"لے لو" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دیدئے۔ اسکو بعد میں افسوس ہوا لیکن شنکر جا چکا تھا۔

---

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازہ پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی ایک چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا "ساٹن کی کالی شلوار ہے ——— دیکھ لینا شاید لمبی ہو اب میں چلتا ہوں"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا۔ اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ دوانوری کے دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس "سودے" کا جو افسوس اسے ہوا تھا وہ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا

دوپہر کو دھنیے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی تینوں کالے کپڑے جب پہن لیے تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے ——— کب بنوائی؟"

سلطانہ جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں "یہ بُندے تم نے کہاں سے لیے؟"

انوری نے جواب دیا "یہ آج ہی منگواتے ہیں"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

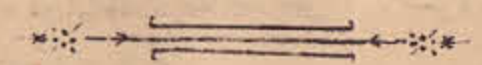

عصمت شاہد لطیف

تل

"چودھری ——— اے چودھری ——— سنو ——"

گنیش چودھری چپ تھا۔

"شش ———"

"..... کیا جھینکر کی طرح شی شی کرے جا رہی ہو" بھنی میں بھک گئی ہو؟

"مرچکی بیٹھے گی کہ ———"

"مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا ——— واہ ——— ساری پیٹھ تختہ ہو گئی ہائے رام۔۔

ہائے ——— ہنک ——— ہنک ———"

"چچ چچ ———"

"مجھے سردی لگ رہی ہے ———"

چودھری چپ۔

"ہائے ——— یہاں نیچے کولھوں میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں"

"دیکھ رانی دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی!"

لائبریری
50 نمبر 15 نمبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"اور کیا ـــــ کوئی میں مٹی کی بنی ہوں، واہ" ـــــ رانی نے اپنے ہونٹ پھیلائے اور مصنوعی سنگِ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔

"چڑیل ـــــ کہتا ہوں سیدھی بیٹھ ـــــ حرامزادی ـــــ" چودھری نے رنگوں کی تھالی اسٹول پر پٹخی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیے۔

"تو ـــــ تو ـــــ تو پھر لو ـــــ" وہ زمین پر لمبی لمبی لیٹ گئی چودھری جل کر کوئلہ ہو گیا ـــــ اس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی قچیاں مارے۔ مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائیگی اور بہانہ کر کے رونے چیخنے لگے گی۔ اور پھر وہ تصویر جس کے لیے وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔

"دیکھ تھوڑی دیر اور بیٹھی رہ ـــــ اور پھر ـــــ" چودھری نرمی سے بولا۔

"تھک گئی نا ـــــ" وہ لوٹ کر چت ہو گئی۔

"تھک گئی! ـــــ اور جو سڑک پر گردن بھر گوبر بینتی تھی تو نہیں تھکتی تھی کتیا کہیں کی" چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔

"کون بینتا تھا گوبر ـــــ تم بینتے ہو گے ـــــ واہ کیسے ساس نندوں کے طعنے دیتے ہو ـــــ" وہ روٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور چودھری کو یقین ہو گیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ سے۔

"اچھا دیکھ گھڑی رکھی ہے یہ ـــــ بس آدھ گھنٹہ ـــــ بھی ـــــ بات یہ تھی چھ سات سے زیادہ تو اسے گننی بھی نہ آتی تھی۔ اور چودھری خوب جانتا تھا کہ چھ منٹ کی بجائے وہ اسے آدھا گھنٹہ جائے رکھے گا۔ رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا۔ اور بھاری پھولدار مشکی جھٹکے سے کاندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی۔ مگر کتنی دیر کے لیے۔

"ٹھیک ہے نا ـــــ؟"

"ہاں ـــــ" چودھری جلدی سے جھک گیا۔

"دیکھو تو ـــــ!"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ـــــ"

"دیکھو تو ـــــ"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ـــــ"

تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے۔ رنگ پر رنگ دوڑتے رہے مگر کوئی ڈیڑھ منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ رانی نے لمبی سی سانس لی۔

"ہا ـــــ بس چودھری ـــــ ہو گئے چھ منٹ!"

"ہوں ہنگ ـــــ" وہ جلدی جلدی کبھی اسے اور کبھی ادھر بنی دھتوں والی تصویر کو دیکھنے لگا۔

"سردی لگ رہی ہے۔ چدر اوڑھ لوں؟"

"نہیں ـــــ"

"آ ـــــ آ ـــــ ئے ـــــ جاڑا ـــــ" وہ کتوں کی طرح رونے لگی۔

چودھری چپ۔

"کمر ـــــ کمر ـــــ میری کمر رے ـــــ چودھری جی ـــــ!" اصل میں وہ آج شرارت پر تلی ہوئی تھی۔

"چدر ـــــ چدر ـــــ میری چدر ـــــ"

چودھری چپ۔

"ہوں ـــــ کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہنڈ یا نچتی ہوں۔ ہاں نہیں تو ـــــ" چودھری جلدی سے مڑا، وہ تصویر مکمل کرنے کے لیے ہنڈیا عجائب خانہ سے مانگ کر لایا تھا۔ مگر رانی تو روٹھ دے تو بس سمجھ لو کہ رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی ـــــ جوں کاٹ رہی ہے چودھری ـــــ" وہ اپنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بالوں کو الجھانے لگی اور پھول اڑ کر نیچے گر گئے۔

چودھری نے پیر دور رکھ لئے۔ آنکھیں گھما کر الو کی طرح باہر نکال لیں اور غصہ سے اس کے چہرہ کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اس کی چتکبری چھدری داڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لہرانے لگی جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید بادبان ہلتے ہیں، اور اس کی گنجی چکنی کھوپڑی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

"لیکے کمر توڑ دی گئی ہے" رانی نے ڈر کر جلدی سے اپنی نشست ٹھیک کرلی اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اوہو — ہو — ہو برر — " وہ ہونٹ بجا کر ڈکرائی۔

"رو — رو — رو — کوئی بھی جانے تو بھی — رو — رو — برر"

چودھری نے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورا — جب کبھی وہ رونے لگتی تھی تو چودھری کے رخساروں کی مچھلیاں پھدکنے لگتیں اور ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہونے لگتا اور پرش ہاتھوں میں پھلجھڑی کی طرح ناچنے لگتے۔ طشتری کے سارے تل ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے اور اسے کچھ نہ سوجھتا اور یہ کرب کی حالت اس پر جب تک طاری رہتی جب تک اس کے دماغ چمٹا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا۔ اور رانی کی حرکتیں اس وقت کانٹا نہیں بھالے بن کر اس کی ہستی کے آر پار نکل جا رہی تھیں۔

ہر دفعہ رانی پر چودھری کے اس دورے کا پورا پورا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ رانی نہ بچ سکی۔ اس نے پھر اپنے پیٹ کو اندر بچکایا اور ہونٹوں سے پھر کتنی ہی آوازیں نکالتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔

تھوڑی دیر تک دنیا پھر اپنے محور پر گھومتی رہی۔ چودھری کا ہر پرش سہلانے بھر ناگیا۔ رنگ کی تھالی گندی اور بدشکل ہوتی گئی۔ لیکن —

"چودھری" اس دفعہ رانی پیار سے بولی۔ چودھری کی بغل میں جیسے چوہا

گھس گیا۔ دنیا کے ایک محور کا پایہ ذرا ٹیڑھا — جانے بھاگی محور میں پائے جاتے ہوتے ہیں یا نہیں — لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

"چودھری تم نے دیکھا ہے — ؟"

چودھری کے کندھے جھرجھرائے اور چکنی ڈلی کی شکل کی کھوپڑی میں پسینے کے والے پھوٹ نکلے۔ وہ پھر بولی۔

"یہ دیکھو — یہ کالا تل — یہ دیکھو گردن سے ذرا نیچے — اور نیچے — ذرا الٹی طرف —" ایک ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کر اور ہونٹ لٹکا کر اپنی گردن سے جھانکنے لگی۔

"دیکھا ہے یہ — تل — اور — تم تو دیکھ رہے ہو چودھری!"

وہ بن کر شرمانے لگی "واہ مجھے تو شرم آتی ہے"

"سیدھی بیٹھ —" چودھری غرایا۔

"اوں — بڑے آئے — بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہوگا۔ اور جب اتنی بڑی جگہ ہو — ہی — ہی — ہی —" وہ اترائی — بڑی ہلکی ہے تل — تم نے دیکھ تو لیا بولو —"

میں نے تل ول کچھ نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں —" بدمزاجی بڑھی۔

"ہوں — جھوٹے — سراسر کانڑی آنکھ کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اور ہا — ہی —" وہ آوارہ عورتوں کی طرح اٹھلائی۔

"رانی"

رانی نے صرف ناک اچکا دی

چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے خالی ڈبے پر بیٹھ گیا —

"تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں —"

"ہائے رام — کوئی — کتنے بڑے؟" وہ ٹھٹھکا کر آگے جھکی۔

"میں تیرے باپ بلکہ دادا کے برابر ہوں — اور تو بتاؤ کتنی ہوگی؟"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

—— پندرہ برس سے آگے نہیں اور تجھے یہ بدمعاشی کی باتیں کس نے سکھائیں"
چودھری دادا برابر تو کیا اس کے باپ برابر بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ذرا معاملہ کو دبانے کے لیے کہہ دیا تھا اس نے۔

"اوں —— بدمعاشی کی باتیں تم کرتے ہو کہ تل دیکھتے ہو —— ایسی بری تو تل ہے ——" وہ آہستہ آہستہ تل ٹٹولنے لگی۔

"ذرا سی چھوکری ——"

"ذرا سی کا ہے کو بول واہ —— ذرا سی کہتے رہتے ہو —— ذرا سی ہوتی تو ——"

"تو —— ؟ تو —— تو کیا؟"

"رتنا کہتا ہے جس کی چھاتی پر یہ تل ہوتا ہے وہ —— وہ ——"

"رتنا؟ یہ رتنا کو کیا معلوم تیرے کہاں کہاں تل ہیں ——"

"میں نے دکھایا تھا ——" وہ تل کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

"تو نے —— تو —— تو —— تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل ——"

چودھری کا پھر خون کھلبلا یا اور بلبلوں میں چوبے چھڈ کے اور گالوں کا گوشت ہلا —— پھر برش پھلجھڑی کی طرح ٹھر کنے اور رنگ بدلنے شروع ہوئے۔

آ —— تو —— واہ —— اس نے دیکھ لیا تو میں کیا کرتی ——"

"کیسے کیسے دیکھ لیا —— تل اس نے جبکہ تو" —— چودھری کی بتیسی ڈھول کو اڑوں کی طرح بجنے لگی۔

"نہا رہی تھی جبا تو اس نے ——" اس نے ٹھکی سنبھالی اور نشست بجنے لگی

"تو نہا رہی تھی —— اور —— وہ آ گیا —— حرامی پلا ——"

"ہاں ٹبیاں پر نہا رہی تھی —— مجھے اکیلے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے اس لیے اسے سنگ لے گئی —— کوئی آ جاتا تو —— میں نہا رہی تھی —— شلوار بھی دھویا ——"

"مجھے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے اس لیے تو اسے لے گئی ——"

"ہاں ——" اس نے بھولپن سے فیصلہ کیا۔

"رانی ——" وہ آگے بڑھا۔

"آں ——" میں نے اس سے کہدیا اُدھر منہ رکھیو —— مگر ——"

"مگر ——؟"

"مگر وہ دور بیٹھا رہا —— پھر میں نے کہا رتنا میرے تل ہے بڑی بری جگہ —— وہ بولا نہیں تو، میں نے کہا تو نہیں دیکھتا تو مت دیکھ۔

ہاں بھئی مجھے کیا؟ —— کیوں چودھری؟"

"پھر تو کیسے کہتی ہے اس نے تل دیکھا؟"

"ہاں پھر میں ڈوبنے جو لگی۔ پانی آیا آیا گبرا تھا" وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں رکھ کر بولی۔

"قطامہ ——! چودھری برش پھینک کر لکڑی کی طرف چلا۔

"ہائے رے رام —— پھر —— پھر سنو تو —— چودھری —— تو —— کیا میں ڈوب جاتی؟"

"تجھے تیرنا نہیں آتا —— کتیا! رات دن ہو دی میں جو ڈبکیاں لگاتی تھی تب نہ ڈوب مری ——!"

"واہ —— واہ میں کیوں ڈوبتی —— میں —— میں —— تو تل دکھا رہی تھی ——!"

"تو نے تل دکھانے کے لیے بہانہ کیا تھا ——" چودھری نے پتلی سی نیچی ہوا میں نچائی۔ وہ اب مکرا رہا تھا۔

"ہائے رام —— مجھے —— دھوتی تو اوڑھ لینے دو —— چودھری جی!" وہ ہندوریا کی طرح اچک کر کھاٹ پر جا کھڑی ہوئی۔

"جو تم مارو گے تو سڑک پر بھاگ جاؤں گی چودھری —— پھر مجھے شرم آئیگی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں کہہ دوں چودھری ـــ چودھری ـــ"

بڈھا ڈک گیا "کیا کہہ دے گی؟ ـــ"

"میں کہہ دونگی چودھری کہتا ہے کہ ـــ میرا تل ـــ اُم ـــ اُم ـــ"

"لچی!" چودھری پاگل گیدڑ کی طرح ناچ اٹھا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیسرا شانے پر بیٹھا!

"سب کہہ دوں گی ـــ سنا چودھری! ـــ مار دو تم مجھے ـــ مار کے بھی دیکھ لو۔ واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو ـــ اتنی چھوٹی ہوں میں ذرا سی چھوکری ـــ بڑے خراب ہو تم جی ـــ" وہ ہلکے ہلکے دروازہ کی طرف بڑھنے لگی۔

چودھری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ کوبی میں آیا۔ اٹھ کر تصویر میں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوسے اتنا کوسے کہ کچھ مر کر رہ جائے۔ مگر اسے نمائش یاد آگئی جس میں اسے پانچ ہزار کا انعام ملنے والا تھا۔

ایک تو اس کا سر ویسے ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصویریں تو بنانے لگا تھا اور ہزاروں تصویریں بنا کر چھوڑ دیں۔ اس نے کھلتے ہوئے گلاب کا شرمایا ہوا رنگ ٹھپہ مارتا ہوا سبزہ، ناچتا تھرکتا آبشار بھی بنایا تھا۔ اس نے سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھا تھا۔ دور دور کے ملکوں کی ننگی اور آرائستہ و پیرائستہ عورتیں بھی اس کے سامنے گھنٹوں بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں۔ مگر یہ چلبلی گنوار چھوکری جس نے اسے موری کی غلاظت سے اٹھا کر اپنے آئندہ شاہکار کے لیے چنا تھا اس کے قابو میں نہ آئی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لینے پر بھی وہ اس کے جسم جیسا مسالہ نہ تیار کر سکا۔ اس نے سیاہی میں صندل گھول کر اس میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا۔ پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی، نیلی اور کچھ بادامی لہریئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر اس کا رنگ سرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں سے شفق کی سی سرخی جھلکنے لگی ـــ اور پھر کبھی بالکل اچانک اس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ

اودی اودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا۔ اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی نیلاہٹ جھلکنے لگتی۔

اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔ اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے گولناز کا سیاہ رنگ گھول کر تیار کر لیا ـــ لیکن پھر اسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے ـــ پھر ان ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح گدلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا اور ڈھیر سا رنگ بیکار کیا۔ لیکن اس کے غصہ کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ کولتار جیسی آنکھیاں سبز ہونے لگیں۔ اور ہوتے ہوتے دو زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیا سفید ہو گیا۔ اور ڈورے فرمزی ہونے لگے ـــ اُف اوہ سر پکڑ کر جھومنے لگا ـــ اور اوپر سے یہ باتیں۔

"مچھر کاٹ گیا ـــ" وہ بچوں کی طرح ٹھنکا۔

آج چودھری نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گھنٹی سادھ جائے گا اور بولے گا ہی

"اتنے مجھے کاٹتے ہیں کہ کیا بتاؤں ـــ یہ مچھر ـــ"

چودھری چپ۔

"ہائے رے ـــ کیسے کاٹتے ہیں یہ مچھر ـــ" اس نے موٹی سی ایسی بازاری گالی دی جو کچھ عام بھی نہیں۔

چودھری اچھل پڑا۔ گالی! یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی موٹی گالی جانتی ہے۔ وہ سوائے چند بالکل زدگالیوں کے ایک بھی گہری قسم کی گالی نہ جانتا تھا اس نے کبھی گالیوں کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا۔ اور یہ گالی شاید داروغہ جی کو بھی آتی ہوگی۔ وہ صرف چند الفاظ استعمال کرتے کے طور پر استعمال کر لیتے تھے ضرورتاً!

"یہ تو نے گالیاں کہاں سیکھیں؟" وہ مڑ گیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"کونسی ـــ یہ ـــ" اس نے پھر بھولپن سے گالی دوہرائی۔

"رانی!" وہ بھبکا

"چنن نے وہی تھی ایک دفعہ مچھروں کو ـــ اس کی کھولی میں بھی بہت مچھر ہیں ـــ" وہ بات ٹالنے لگی۔

"اس کی کھولی؟ ـــ تو اس کی کھولی میں بھی گئی تھی؟"

"ہاں وہ لے گیا تھا کہ چل گڑ دھانی کھائے گی!"

"پھر گڑ دھانی کھائی تو نے؟"

"کہاں گڑ دھانی تھی بھی نہیں، جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر اب لا دیتا ہے!"

"تجھے چنن گڑ دھانی لا دیتا ہے ـــ؟"

"ہاں، اور کھیلیں" وہ بھنگی پر نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔

"اور کھیلیں! ـــ" چودھری جانتا تھا کہ وہ بیکار حیرت زدہ ہو رہا ہے رانی گڑ دھانی پر فریفتہ تھی۔ وہ چنن کی کھولی چھوڑ موری میں کنول کے جڑ میں سے گڑ دھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے پیسے دیئے پھر بھی تو چنن کی گڑ دھانی لیتی ہے؟"

"داؤں۔ میں کب لیتی ہوں۔ میں کوئی منگتی ہوں وہی دیتا ہے۔ کہتا ہے کھولی میں ـــ مجھے وہ آپ بڑا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی مونچھیں ہیں ـــ تو چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خوں ـــ خوں ـــ" وہ ناک سکیڑ کر پھڑ پھڑانے جیسے کسی نے اس کی ناک میں بتی کر دی ہو۔

"ذرا پیٹھ کھجا لو ـــ چودھری ـــ" پھر چودھری پر وہ دورانی کیفیت لگیں۔ بھیجے میں نالیاں سی بجنے لگیں۔ اور گال اوپر نیچے کودنے لگے۔ پانچوں کھنن کھنن اس سے اور ننھے ننھے تاروں کی طرح ناچ ناچ کر بھاگنے لگے کالا، سرمئی اور پیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو لگے۔ اور کھوپڑی پر آبلے سے ابھر آئے۔

اب سوال یہ تھا۔ تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہ تھا جب وہ بیچ بیچ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باؤلے کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دہکتے ہوئے سر کو تلیا کے پانی میں ڈبو دے۔ یونہی اس کے قدم تلیا کی طرف اٹھ گئے۔ تلیا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطح آب پر تھرکتے ناچتے دیکھتے چلا جایا کرتا تھا۔ اور وہ شاعر تھا ـــ پیدائشی شاعر، وہ دنیا میں تو رہتا تھا۔ مگر دنیا سے کتنا دور۔ بڈھا تو وہ نہ تھا ـــ مگر جوان بھی اسے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔

اس نے داڑھی لاپروائی کی وجہ سے چھوڑ رکھی تھی۔ اور وہ کچھ یونہی سی چڑچڑی ہو چلی تھی۔

"اوہ!" پھر اس کی پلکوں میں کوئی چیز پھڑپھڑائی ـــ رانی کی آواز ایک ہراساں ہوئی مینڈک کی آواز کے ساتھ آئی۔ مینڈک ہی ہوگا۔ اور کیا۔ برسات ـــ خیر برسات تو دور تھی ـــ مگر نہیں مینڈک نہیں بتی خراب ہوگی ـــ بتی وتی ہاں کچھ ہوگا ضرور۔ ـــ

لیکن جب اس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے سنگ پانی میں چھپلیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ اسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا۔ تخیل سے چھیڑنے کے لیے نئے نئے بہانے تراشا کرتا تھا۔ اور آج تو حد کر دی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو ہنسی کے زمزمے رک گئے۔ اور وہ حیرت زدہ سی موسی کے سے مجسمے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا وہم بالکل صاف، رتنا کے ہونٹوں کا ابھار۔ پانی سے بھیگی ہوئی اس کی لمبی چوٹی ـــ قریب قریب بیٹھی ہوئی دو آنکھیں ـــ اور رانی کی الجھی ہوئی چوٹی ـــ (سرمئی، عنابی، صندلی، کاسنی اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا تل!) ـــ وہاں ابھرا ہوا ـــ گولی کی طرح چودھری کے سینے میں کھٹ سے آکر لگا ـــ ایک طرف کو سرکتا، بچتا رتنا تو نکل گیا اور بھاگا دھوتی اٹھا کر اور رانی دلیری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے کھڑی چھپ چھپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کوئی اسے جھولے میں ڈال کر لمبی لمبی پینگیں دے رہا ہو۔

"تل دیکھ رہے ہو میرا ــــ بڑے بڑے ہوجی ــــ" وہ منانے کے لیے اتنی لگی۔ چودھری شکر ہے کہ کھٹکے کنا سے آکر سنبھلا۔

"باہر نکل ــــ!" اس نے اس نے چودھری کو ڈھکیلتے ہوئے کہا جو دیے دیے ڈھو بتا جا رہا تھا۔

"اوں۔ تم مار دگے ــــ" وہ پانی میں سے اوپر اُبھر آئی۔

"آج تجھے اڈھیر کر نہ ڈال دیا تو میرا نام چودھری نہیں ــــ" چودھری نے خود کو یقین دلایا کہ یہ وہی نوچھوکری تھی جو کچڑ میں مینڈکی کی طرح پل رہی تھی۔

"عورت پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتے گی ــــ" چودھری سلگ گیا

"ننگی عورتوں کو پیٹے ہوا ــــ واہ ــــ" وہ اور اوپر ابھری ــــ

"شرم نہیں آتی ــــ" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور پانی اس کے ٹھوڑی تک آرہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اسی لیے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔

"اوں ــــ جاؤ ــــ" وہ شرمانے لگی

چودھری کے ہاتھ سے لچکتی ہوئی قمچی گر گئی اور اس کا قد کئی انچ لمبا ہوگیا اس کے بازو پھول گئے۔ اور جسم میں سُرسُریاں سی رینگنے لگیں۔ بھوبل کے الاؤ کو ٹھنڈی ٹھنڈی سیاہ آندھی بہالے گئی۔ اور چنگاری سی بھڑکی ــــ ڈھڑ دھڑ دھڑ شعلے لپکنے لگے۔ اس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ ابھرے ہوئے تل جیٹیں اور ــــ اوہ گھن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر اپنے کمرہ میں پلنگ کی طرف ــــ اسی دن اس نے رتنا کو نکال دیا ــــ وہ بہتیرا کہتا رہا کہ وہ لنگوٹ پہنے تھا۔ مگر چودھری پر تو بھینسا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ کوئی چیز اس کے جسم میں برے

طرح سوراخ کر رہی تھی ــــ مگر سوراخ ہو ہی نہ چکتا تھا ــــ جیسے کوئی چٹان راستہ میں آگئی ہو۔

آج اسے اپنی تصویروں میں لگانے کو رنگ مل رہے تھے۔ کنکھی میں ذرا سی نیلاہٹ ملا دینے سے بالکل وہی ــــ وہی بھیگا ہوا سمندر کی تہہ جیسا گہرا اور جیتا جیتا رنگ بن گیا ــــ اور آنکھوں کے لیے بھی بس سیاہی میں ملکی سی سبزی ــــ نہیں اودا ہنٹ یا شاید سرمئی رنگ اور پھر گلابی گوٹ ــــ جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا ــــ اس نے چاہا آئینے میں اپنی صورت دیکھے ــــ لیکن آئینہ تو جانے اس نے کب سے نہیں دیکھا تھا ــــ ایک مصور کو آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے؟ اس کا آئینہ تو وہ ساری تصویریں تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ اس کی روح کا کونہ کونہ نظر آتا تھا۔ اس کا دل اور دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں میں سمایا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اس نے چاہا کہیں اپنی صورت دیکھے! اس نے ایک ٹین کے ڈبے لوہے میں اس کے رنگ دور دور کے شہروں سے آیا کرتے تھے الٹ کر جھاڑا۔ دو جھینگر ٹھدک کر اس کی ناک پر ٹپا کھاتے اڑ گئے ــــ مکڑی کا جالا اس نے کہنی سے جھاڑ کر اپنا منہ دیکھا ــــ

پہلے تو اسے کچھ نظر نہ آیا ــــ جیسے سمندر کی تہ میں باریک باریک جھاڑ اور جھنڈ سے ہوتے ہیں ــــ یا جیسے آنکھوں میں پلکیں گھس جاتی ہیں تو پھیلا پھیلا دکھائی دیتا ہے ــــ ویسا دکھائی دیا۔ پھر ایک بھیانک داڑھی اور پیاسی پیاسی آنکھیں دکھائی دیں ــــ اوہ، یہ وہ خود تھا! وہ؟ وہ ــــ جو ــــ ایسا تو کبھی تھا ہی نہیں ــــ ایسا؟ اس نے ٹین کا ڈبہ اوندھا دیا اور بغیر آئینہ کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے داڑھی تو خیر نظر نہ آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی سی کالے دہانے والی ناک اور پھولی ہوئی مونچھ دکھائی دی ــــ مونچھ! ــــ اگر قینچی ہوتی تو ــــ ذرا ــــ ذرا سا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مونچھ کو ویسا کر دیتا ـــــ رانی کہتی تھی چنن کی مونچھوں سے چمبیلیں آنے لگتی ہیں
ـــــ فوں ـــــ فوں ـــــ وہ خود بھی ناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ رتنا
لنگوٹ پہنے تھا۔ کیا عجب دھوتی بھی ہو۔ ـــــ پہنے ہو ـــــ یا پہننے والا ہی
ہو کہ وہ آ گیا مگر یہ چنن اور اس کی گڑ دھانی!

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گڑ دھانی کی بنی ہوئی ہیں اور
اسے بھینچے ڈال رہی ہیں ـــــ وہ ایک لمبی ہوئی مکھی کی طرح گڑ دھانی کے ایک
بڑے سے ڈھیر پر چپکا ہوا ہل رہا ہے جب وہ ہلتے ہلتے تھک گیا اور ٹانگیں شل
ہو گئیں تو وہ اسٹول پر ٹک گیا ـــــ پردہ اٹھا کر اس نے اپنی ادھوری محنت
دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے اور ایک دم ٹھہر گئے
شانے پالش کئے ہوئے چمڑے کی طرح چمکنے لگے اور آنکھوں میں نیلی، کالی، ہری
روشنیاں گھومنے لگیں ـــــ اور تل! یہ تل کہاں سے آیا۔ سانپ کی طرح گول کی
مارے ابھرا ہوا تل۔ ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔ گھڑی کی طرح اس کا
ہلنے لگا۔

وہ ایک دم اٹھا اور اس کے پیر رانی کی کوٹھڑی کی طرف اٹھ گئے۔ گن
نیلی چھوٹے سے دروازہ کی گھٹی ہوئی کوٹھڑی! ـــــ وہ کل ہی اوسے اونچا کرا
ـــــ نہیں ـــــ اونچا نہیں ـــــ وہ جو دوسرا کمرہ ہے، جس میں خالی ڈ
بڑے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ وہ اندھیرے میں بڑھنے لگا ـــــ اس کا دل ا
گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کوٹھڑی کی سیاہی گھٹی ہوئی کا لوچ کی طر
اس کے چاروں طرف لپٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے ٹکرا
اور ـــــ پھر بان کے جھولے میں دھنس گئے ـــــ اس نے جلدی جلدی
پلنگ ٹٹول ڈالا مگر رانی نہ تھی!

سارے بدن پر جیسے مچھروں نے لپٹ کر چٹکنا شروع کیا ـــــ ہو
ہوئے، ٹھنے لگاتے ہوئے مچھر! ـــــ اور پھر گڑ دھانی کی سلیں کی اس

ٹوٹ پڑیں۔

صبح اس نے چاہا کہ رانی کی ٹھٹیا اسٹیٹ کر اس سے پوچھے حرامزادی یہ رات
کہاں گئی ـــــ مگر کوئی کہے گا کہ وہ راتوں کو اس کا پلنگ کیوں ٹٹولتا ہے!

وہ چپکا کام کرتا رہا۔ اور رانی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ بولے۔ شاید
رات کے اڑے کا پتہ چلے مگر وہ منہ بنائے روٹھی بیٹھی رہی۔

"کیوں کیا تھک گئی؟" ـــــ اس نے اسے ٹھنکی رکھتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔
آج وہ اس سے لڑنا چاہتا تھا۔

"اور کیا ـــــ میں مٹی کی بنی ہوں؟" ـــــ وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں
سے دبانے لگی۔

چودھری جی چاہا کوئی نرم سی بات کہے۔ مگر اسے اپنا انداز بدلتے ذرا
شرم سی آئی۔

"بے لس اب سستا چکی ـــــ" وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ لڑے گی اور خبر مگر
رانی نے مٹکی اٹھا کر پھر جسم کو ویسے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تینتا اٹھے جو رنگ لگا یا منہ چڑانے لگا ـــــ آج اس نے سوچا
خاکہ بھی بنا دے گا۔ یوہی ـــــ تصویروں میں کیا تل نہیں ہوتے۔ مگر بیگوں
کے مزاج بگڑے دیکھ کر وہ ٹال گیا۔

جب رانی اٹھ کر چلی تو گڑ دھانی کا ٹکڑا اس کی دھوتی میں سے گر پڑا۔
اسے خبر بھی نہ ہوئی مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر پر
آسمان ٹوٹ پڑا۔

"یہ ـــــ گڑ دھانی ـــــ!" اس نے غصہ سے جھاگ اڑانے شروع کئے۔
پہلے تو وہ رنگی کہ اٹھالے مگر چودھری کے تیور دیکھ کر وہ چل دی۔

"تم کھا لو ـــــ" اس نے عرصہ سے گردن اٹھا کر کہا۔

چودھری پر پھر مرگھٹ کا جنتا سوار ہو گیا ـــــ وہ رانی کو جاتے ہوئے

مصور لائبریری
بلاک نمبر 15 - مکان نمبر 50

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیکھتا رہا ـــــ اور پھر ایک دم جو نہ کی ایڑی سے اس نے گرد دھاتی کو زمین پر گرا کر
ڈالا ـــــ

دوسرے دن رانی خدا جانے کہاں غائب ہوگئی۔ اس نے دو چار کپڑے
لینے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر موت کچھ میں رُلنے کے
لیے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی۔ پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی
صورت میں اس کے دماغ پر جم گئے ـــــ سیاہ دھبہ جیسے ننھا سا ابھرا ہوا تل
مگر کتنی بری جگہ تھا یہ سیاہ جلا ہوا نشان ـــــ بالکل چودھری کے
میں!

اس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا ـــــ ڈر کے مارے وہ کسی
کہتا بھی نہ تھا کہ رانی بھاگ گئی۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی کہے نہ کہ آخر
گئی تو کیا ہوا۔ وہ کیوں مرا جاتا ہے لہٰذا دن گذرتے گئے وہ تصویریں بنانے
کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی چوچو آنہ میں بھی اس کی تصویریں نہ لیتا تھا
وہ اس قدر بھدے، ڈراؤنے، سیاہ، بھورے اور کالے رنگ شفق اور
میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اسے الو سمجھتے تھے۔ اس کے سارے رنگ گلا
خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے۔ لوگ رانی
متعلق اس سے بار بار پوچھتے، تو کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ
سیدھے سادے جواب کو کب پسند کرتے ہیں:

"چودھری رانی کو بیچ آیا!"

"ایک سوداگر آیا تھا جو کئی ہزار دیکر لے گیا۔"

"رانی سے بُرا تعلق تھا۔ ناجائز ـــــ کہیں پار کر دیا ـــــ"

جتنے منہ اس سے دونی باتیں۔ چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھڑی

معلوم ہوتا تھا دُنیا اسے نگل کے کھا جانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں لطیف زندگی کی نوجیب
اب رانی ایک چھوٹی سی خون آلود گٹھڑی ایک الگ راستے میں رکھتی ہوئی
ں کے پہنے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی اور چودھری کے رہے سہے حواس
ہو گئے۔ رانی کے گم ہونے کا عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا۔ اور چودھری
کا منہ پھاڑے رہ گیا ـــــ اف اس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک
ں نا انصافی اور اندھا دھند کے ہاتھوں کچلی گئی ـــــ مگر وہ جانتا تھا کہ خدا
واہ مخواہ کا اس سے بیر نہیں، وہ ایسے صاف بچ جائے گا جیسے
بے گناہ بچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنچ کہاں ـــــ مگر کاش وہ شریکِ
م ہی رہتا۔

تو پھر وہ جرم ہی رہتا ـــــ یوں تو وہ مجرم تھا ہی آخر اس نے پیدا ہو کر
ا جرم کیا تھا۔

ہاں تو کاش وہ شریک جُرم رہتا ـــــ فہد بھگتتا ـــــ معصیتیں دکھ درد پیتا
ر کی ذلتیں اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ ہنس ہنس کر گود میں لپک لیتا۔ اسے پتہ
وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کیوں گڑگڑا کر خدا کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرتے
گتا ـــــ ہاں یہ تو تھا کہ ـــــ ذرا تل ـــــ ہاں خیر! ـــــ مگر خدا کیا
بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔ اسی نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے
گا دی ہیں ـــــ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جب رانی سے بازپرس ہوگی اور سرکاری
چاروں طرف سے چودھری کو منطق کے جال میں گھیرے گا تو وہ یہ داؤں
گا ـــــ اور یوں اسے آزاد ـــــ یا دوسرے معنوں میں برباد کر دے

"چودھری کا نہیں تھا ـــــ" اس نے بھری کچہری میں حلف اٹھا کر کہہ دیا۔
"چودھری تو ہیجڑا ہے ـــــ" اس نے لاپرواہی سے کہا ـــــ "رہتا ہے
ہاجن سے ـــــ اب مجھے کیا معلوم ـــــ واہ" وہ اپنی پرانی ادا سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُٹھلاتی۔

ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہتھی پر بیٹھا
اور دور ـــ سیاہی میں اور بھی سیاہ گول ـــ ابھرا ہوا نقطہ پھر کی طرح
گھومنے لگا ـــ!

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے کوئلہ سے لکیریں کاڑھا کرتا ہے
لمبی ـــ ٹیڑھی ـــ گول ـــ جیسے جلا ہوا داغ ـــ!

علی عباس حسینی

ہار جیت

چھبدی پور کی اہیر ٹولی سے جو ملا ہوا آموں کا باغ ہے اس میں بڑی چہل پہل تھی۔ نوبیتا اہیر کے یہاں رام گڈھ سے جو برات آئی تھی وہ اسی میں اتاری گئی تھی۔ متعدد چولھے روشن تھے۔ بڑی بڑی کڑھائیاں چڑھی تھیں۔ پوریاں چھن رہی تھیں، ترکاریاں بنائی جا رہی تھیں۔ براتیوں کے سامنے کیلے کے پتے اور بڑے بڑے "پتر" رکھے تھے۔ گھرانی "گرم گرم پوریاں اور بھاجی" ہر ایک کے سامنے پرس رہے تھے۔ نوجوان براتیوں میں "لاگ ڈانٹ" تھی کہ دیکھیں کون سب سے زیادہ کھاتا ہے۔ جناتیوں نے بھی پوری پر پوری پیش کرنا شروع کر دی۔ کسی نے آدھ سیر، کسی نے تین پاؤ، کسی نے سیر بھر پوریاں کھائیں مگر رام دُلارے کا پیٹ تھا کہ بھرتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک "بیٹھک" میں ڈیڑھ سیر پوریاں کھا گیا۔ پھر جب ہارنے والے مقابل نے کہا کہ اس کی نہیں پوریاں گھی میں تر تھیں۔ مزے کی تھیں، گرم گرم اور نرم نرم تھیں۔ نان کھا گئے روٹی کھاتے تو البتہ جانیں مرد ہو، اس لیے لڑکی والوں سے دوسیر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آٹا، آدھ سیر دال اور چھ تیس اُپلے منگاتے۔ دال ایک ہانڈی میں چڑھا دی آٹا کیلے کے پتے پر اپنے ہاتھ سے گوندھ ڈالا۔ اور اُپلوں کو مربع صورت میں ایک کے اوپر ایک "سرپاک" رکھا۔ اور ان میں آگ دکھا دی۔ جب اُپلے جل کے "لہکنے" ہوتے کوئلوں کے مانند ہو گئے تو اس نے گندھے ہوئے آٹے کی دس بارہ "لوئیاں" بنائیں۔ اور انھیں اس آگ میں ڈال کے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دال اور لوئیاں تیار ہو گئیں تو وہ چار زانو بیٹھ کے نہایت اطمینان سے انھیں بھی اڑا گیا۔

مقابل نے کان پکڑ کر کہا "بابا میں ہار اتم آدمی نہیں راکشش ہو"

نوجوان جناتیوں نے طنز دیا، بہت سا کھا لینا بڑی بات نہیں۔ ہمارے یہاں بھینسیں ناند کی ناند صاف کر جاتی ہیں، کوئی "گن" ہو تو بات ہے۔ رام دلارے نے بہ ہا، گانے بیٹھ گیا۔ اب جناتیوں کی طرف سے باقاعدہ مقابلہ شروع کر دیا گیا۔ جب یہ ایک برہا گا چکتا، وہ جواباً دوسرا گاتے۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوتے یہ تیسرا شروع کر دیتا۔ غرض یونہی سوال و جواب کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔ مگر ان میں اور رام دُلارے میں فرق یہ تھا کہ وہ سنی سنائی چیزیں گاتے تھے اور یہ خود فی البدیہہ کہتا اور گاتا جاتا تھا۔ کئی کئی آدمیوں نے مل مل کے مقابلہ کیا۔ مگر اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے والا دوسرے پر بھروسہ کرنے والوں کو ہمیشہ مار گراتا ہے۔ اس لیے رام دلارے کے آگے ایک کی بھی نہ چلی۔ اور سب کے سب سیلی ہوئی آتشبازی کی طرح پٹس پٹسا کے رہ گئے۔

جناتیوں نے جب یہ دیکھا کہ برہے میں جیتنا محال ہے تو مقابلہ کا رُخ بدل دیا۔ "لڑکی" چھیڑ دی۔ یہ بلا کی چیز ہے۔ اس کا "اور" ہے نہ چھور ہے۔ "مہابھارت" اور رامائن کے زمانہ سے قصہ شروع ہوتا ہے اور انتہا ہوتی ہے آج کل کے اخبار پر جتنے قصے اور فسانے دیہاتوں میں سجوے بھگتے یاد رہ گئے ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں اور سب کی تان اہیروں کی تعریف پر ٹوٹتی ہے۔ اس کا سلسلہ ہفتوں جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے جب جناتیوں نے "لڑکی" چھیڑی تو رام دلارے

مسکرانے لگا، وہ جانتا تھا کہ حریف نے برہے میں شکست کھانے بعد باقاعدہ "پسپائی" کی یہ صورت نکالی ہے۔ وہ خاموش تو ہو گیا۔ مگر موقع موقع سے اپنے وار سے باز نہ آیا جہاں مقابل چوکا یا کوئی "کڑی" بھول کے گیا اس نے فوراً تتبع کر دی یا قافیہ دے دیا۔ غرض لڑکی میں بھی جیت کا سہرا اسی کے سر رہا اور جناتی کئی محاذ پر شکست کھانے کی وجہ سے جھلانے لگے۔

جب دولھا کے باپ نے دیکھا کہ جناتیوں کے تیور اچھے نہیں ہیں اور رنگ میں بھی بھنگ ہونے والا ہے تو اس نے اپنے ہفتاد سالہ تجربہ سے کام لیا۔ اور اپنے ساتھی نوجوانوں کو بھجوایا کہ رات زیادہ آئی، تھوڑی سی تھوڑی دیر سو رہیں، پھر صبح مقابلہ ہوتا رہے گا۔ ہمارے سب نے اس کا کہنا مان لیا۔ چلمیں بھر بھر گئیں۔ اکڑوں بیٹھ کے، ہاتھ کا چونگا بنا کے اور اس میں چلم رکھ کے سب نے دو دو چار چار لمبے لمبے "کش مارے"۔ اور وہیں درختوں کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں انگوچھا بچھا بچھا کر لمبی تانی۔ جاگا ہوا فسنہ یوں تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔

صبح سویرے ہی گاؤں میں شب کے مقابلے اور گاؤں والوں کی شکست کی خبر گرمیوں کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر شخص چماپو یا پاسی، شیخ ہو یا برہمن پرجا ہو یا زمیندار، اپنی اپنی جگہ بل کھانے لگا۔ گاؤں کی عزت کا ہر ایک کو خیال تھا۔ یہ ناک کٹنے والی ہی بات تھی کہ چار کوس سے برات آئے اور چھدی پور والوں کو ہرا کے چلی جائے۔ رام دلارے کھانے میں بھی جیتے اور گانے میں بھی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ جگ ہنسائی نہیں سہی جا سکتی۔ اسی لیے اس سورما کو نچا دکھانے اور اپنے یہاں کے اہیروں کا دل بڑھانے کے لیے ہر فرقے اور پیشے کا آدمی باغ میں آ کے جمع ہو گیا۔

وہاں وقتی اکھاڑا کھود لیا گیا۔ جناتی اور برادری مل جل کے ورزش کرنے والے تھے کوئی لنگوٹ کس رہا تھا، کوئی جانگیا پہن رہا تھا، کسی نے ایک معمولی سی چست

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے ستر پوشی کر لی اور کسی نے لنگی ہی کا "کاچھا" باندھ لیا۔ جوان ڈنڈ، بیٹھک، سپاٹے میں مشغول ہوئے۔ لونڈے اپنی کسرت کے کرتب دکھانے لگے۔ ان میں سے کوئی چند قدم دوڑ کے آتا اور بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر جھک لگا کے ایک ساتھ کئی کئی قلا بازیاں اس صفائی سے کھاتا کہ سوائے بجلیوں اور بچوں کے کوئی حصۂ جسم خاک سے مس نہ ہوتا۔ کوئی دوڑ کر زمین سے دو ڈیڑھ گز بلند اچھلتا اور ہوا میں گرہ لگاتا۔ کوئی لکڑی کے سہارے بہت لمبا اور بلند پھاندتا۔ اور کوئی "جٹھرا" ایسے صحیح نشانے سے پھینکتا کہ درخت کی جو سی پتی ٹوٹتی وہی ٹوٹ کر زمین پر گرتی اور دوسروں پر "رپ" تک نہ آتی۔

رام دلارے بھی اکھڑا ہی لیتا ہوا منھ اور لنگوٹ باندھ کے اکھاڑے میں اتر گیا۔ پہلے اس نے شانوں اور گردن پر مٹی لگائی، پھر ڈنڈ کرنے شروع کیے۔ جب تعداد دو ڈھائی سو سے زائد ہو چکی تو وہ بیٹھک اور سپاٹا لگانے لگا۔ جب ان کے اعداد بھی ڈنڈ کے قریب قریب پہنچ گئے تو وہ مگدروں کی اس جوڑی کی طرف متوجہ ہوا جسے چھ دی پوربیں دو ہی ایک آدمی اٹھا سکتے تھے۔ اور محض قوت کی آزمائش ہی کے لیے بنوائی گئی تھی۔ رام دلارے اس جوڑی کو آدھ گھنٹے تک ہلاتا رہا۔ پھر براتیوں کے اصرار سے اس نے دس بارہ نوجوانوں کو زور کرایا اور اکھاڑے میں قدم گاڑ کے مبارز طلب نگاہوں سے جناتیوں کو دیکھنے لگا۔ چھ دی پور والوں میں سے دو تین جوان جنہیں اپنے ورزشی جسم اور داؤں پیچ پر گھمنڈ تھا مقابلہ کے لیے اکھاڑے میں اترنے کا قصد رکھتے تھے۔ مگر رام دلارے کی ورزش اور قوت کا حال دیکھ کر خاموش ہو رہے۔

رام دلارے اور اس کے ساتھی جب اکھاڑے سے نکلے تو جناتیوں نے تازے تازے دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں اور ایک حقہ بھر بھیگا ہوا چنالا کے رکھ دیا۔ ہر ایک چنا "چا" بننے لگا۔ رام دلارے بھی ٹہل ٹہل کے جسم سکھاتا اور چنا کھاتا رہا۔ جب جسم خشک ہو گیا تو وہ ایک پوری بالٹی دودھ پی گیا۔ اور کپڑے

پہن کے ایک درخت کے تنے سے سہارا لگا کے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور لڑکوں کی اچک پھاند دیکھنے لگا۔

مگر اہیروں کی بارات میں ان کا ہیر و نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ بات نہ لڑکے والوں کو بھاتی ہے نہ تماشائیوں کو۔ براتیوں کو یہ کد ہوتی ہے کہ جناتی کسی بات میں نہ جیتنے پائیں۔ جناتیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کو کسی نہ کسی مقابلے میں ہرانا ہی چاہیے۔ اس لیے اس موقع پر بھی اب اصرار شروع ہوا کہ ناچ میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ رام دلارے اس فن میں بھی براتیوں کی نظر میں یگانۂ روزگار تھا۔ اب اس سے بہتر موقع اس "کرتب" کے دکھانے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ قریب قریب گاؤں بھر جمع تھا۔ سب اس "بیرنگن" دیکھنے آئے تھے۔ بھلا یہ وقت خاموشی کا تھا۔ رام دلارے باوجود شدید اصرار کے پہلے تو ٹالتا رہا۔ مگر جب اہیر ٹولی سے اہیرنوں نے اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کر ملنے دینا شروع کیے اور دو ایک ناچنے اور ٹھمکنے بھی لگیں تو اسے بھی جوش آ گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی ابتدا اس نے بھجن والے برہے سے کی:۔

رام رام کی بھجن کرو، رام پر دھرو دھیان[1]
محرم ہوئے وہی پہچانے ایسا دیس ہمارا ہے
جہاں جہاں جانے بیرن ہو بیٹھے، بھجن بھجن سو نیارا ہے
جان برت پوچھے نا کوئی، پوچھت نا بہوارا ہے
جلک بوند گرے جل ہی ماں، نا میٹھا نا کھارا ہے
سندر مدل بیچ نوبت باجے، مرلی بین ستارا ہے
محرم ہوئے وہی پہچانے ایسا دیس ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو۔ رام پر دھرو دھیان

---

[1] رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔ ہم جہاں کے ہیں اسے سوائے محارم اسرار کے کوئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ناچتے ناچتے ٹھٹک کے رُک گیا۔ اہیروں نے ایک دوسرے کے پہلو میں کہنیاں ماریں اور بولے۔ اب مقابلہ برابر کا ہوا، رام دلارے ایک ترپھ تو لاکھی دوسری ترپھ!

رام دلارے نے تو لکھی کا نام سنتے ہی اسے بغور دیکھا۔ بادل ماں جیسے چند ماچکے۔ ویسا ہی میلی ساری میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس پر آفت گنوالیسی بڑی بڑی مدھ بھری آنکھیں اور ہنس ایسی لمبی اور ٹیڑھی گردن۔ سڈول بھرا بھرا جسم، نئے پودے کی طرح نرم نرم ہاتھ پاؤں۔ پھڑ تیلے بچھڑے کی ایسی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی۔ بڑی شسندر جان پڑی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس نے تو لاکھی کو دیکھا ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ لبریز جام بھی چڑھا لئے۔ اس لئے کہ وہ اپنے میں عجیب طرح کی سرخوشی محسوس کر کے ایک پُرانا برہا ناچ کے گانے لگا۔

ایک سمے میں ہری روپ بدل لاں، دھلیلیں بید کا بھیس
کھوری کا کھوری گھومے بید وا، سہر ماں کو نو ہے بیماری؟
اپنے محل سے نکلن رادھکا، دیکھن بید صورت تمہاری

---

۱ اب مقابلہ برابر کا ہوا۔ رام دلارے ایک طرف۔ تو لاکھی دوسری طرف۔

۲ ایک بار کرشن نے بھیس بدلا اور وید بن کر گلی گلی گھومنا اور پکارنا شروع کیا کہ اس شہر میں کوئی بیمار تو نہیں ہے وید حاضر ہے، رادھا اپنے محل سے نکل پڑیں۔ اور وید کی صورت دیکھ کے پہچان کے بولیں "اے وید جی ادھر آیئے میری بیماری تو بچا لیجئے" انھوں نے کہا "میں تمہاری بیماری بھلا کیا بچاؤں گا۔ تم خود ایسی آفتِ روزگار ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی میری بیماری چھوٹ جاتی ہے" اس پر رادھا بولیں "اچھا میرے پاس تو آیئے میں آپکی خدمت کروں گی آپکو روپیہ پیسہ، جگہ زمینداری سب کچھ دونگی، گوکل کا راج نذر کرونگی بس اٹھائے سے بیٹھ کے حکم کیجئے" وید نے جواب دیا "مجھے تمہاری دولت، تمہاری زمینداری اور تمہارے راج کی خواہش نہیں ہے میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ سو اگر تم مجھے اپنا شوہر بنا لو تو راضی ہوں"

آؤ بید امیری نگریا، پہچانوں میں تیری بیماری
نا دیکھوں تو ری سردی گرمی نا دیکھوں تو ری بیماری
تم ناری اس سنگ سجنی ہو جگ کہتی ہے سب ناری
آؤ نا بید امیری نگریا، کھدمت کرے تمہاری
آؤ رے ہم دھن دولت اور جاگہ جمیداری
اور دیبا گو کلا کا راجوا، بیٹھل کریہا بہاری
نا چاہوں تو رے دھن دولت، نا لیوں تو رجگ جمیداری
ہم چاہیں رسوں کا کلیا، ہم ہی پرس توں ناری

آخری ٹکڑا "ہم پرس توں ناری" رام دلارے نے آگے بڑھ کے اور تو لاکھی کی طرف اشارہ کر کے اس طرح کولے کو حرکت دے کے گایا کہ سارا مجمع ہنستے ہنستے بے تاب ہو گیا۔ تو لاکھی بھی دل ہی میں کٹ گئی۔ مگر حریف کے پہلے ہی وار میں جھک کر پیچھے ہٹ جانا شکست ماننے کا پیش خیمہ تھا اور وہ اس لئے تیار نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے مقابلوں میں "ور" ہی رہتی تھی اس لئے قبل اسکے کہ رام دلارے کچھ اور کہہ سکے اس نے یہ ہے کی آخری کڑی حد درجہ تحقیر آمیز لہجے میں ہاتھ چمکا کے گا دی:۔

"نیا پر چڑھ کے گوں کاٹے لا کنہیا آکھر جیتا کا توں اہیرہ"

ناگن نے سپیرے کا پہلا وار خالی ہی نہیں دیا بلکہ چوٹ کر گئی!

گھنٹوں مقابلہ ہوتا رہا۔ دونوں نے اس قدر برہ ہے اور گیت گائے کہ گلے پڑ گئے۔ اب خاموش ناچ کا جواب ناچ سے دیا جا رہا تھا۔ رام دلارے نے کرتہ اتار کر پھینک دیا تھا۔ دھوتی کا کاچھا کس لیا تھا۔ تو لاکھی نے ساری

---

۱ کنہیا کشتی پر چڑھ کے چکر لگاتے ہو یعنی ہر پھر کے اپنے ہی مطلب کی کہتے ہو آخر تم ذات کے اہیر ہی ہو نا!

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا آنچل کمر سے لپیٹ لیا تھا۔ اور "پھینی" لنگی کی طرح یوں کھینچ کر پیچھے کھونس لی تھی کہ گوری گوری پنڈلیاں صاف دکھائی دیتی تھیں چہرے پر پسینے کی بوندیں گلاب کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کی طرح جھلک رہی تھیں۔ آنکھیں خون سے بھری کٹوریاں ہو رہی تھیں۔ ہونٹ بالکل بنفشی تھے، مگر مسکراہٹ سے دانتوں کی بتیسی بار بار چمک اٹھتی تھی۔ اور کمر اور کولہے کی حرکت برابر مشین کی طرح جاری تھی۔

رام دلارے کو زیادہ تکان نہ تھا، وہ مرد تھا، پہلوان تھا، بن بیاہا تھا، دس بارہ گھنٹے ایک طرح ناچ سکتا تھا۔ مگر مقابل کوئی مرد نہ تھا۔ ایک نازک اندام، سیمتن عورت تھی۔ پھر بھی وہ گھنٹوں سے کھڑی برابر کا مقابلہ کر رہی تھی ہر برہے کے جواب میں کوئی برہا یا گیت گاتی۔ جب تک گلا نہ پڑا تھا خاموش نہ ہوئی تھی۔ ناچتی بھی اس خوبی اور دل فریبی سے تھی کہ جسم کی ہر حرکت اور اعضا کی ایک ایک جنبش بوڑھے "پھولنس" اہیروں کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتی تھی۔ اس کا استقلال یہ بتاتا تھا کہ وہ بات پر جان دیدے گی۔ مگر مار نہ مانے گی۔ انداز کہتا تھا کہ تھک کے چور ہو گئی ہے۔ مگر مسکراہٹ بتاتی تھی کہ جب تک دم میں دم ہے ناچے جائے گی۔ رام دلارے نادیدہ عاشق تھا۔ پیغام بھیج چکا تھا مگر آج باہمت مقابلہ نے اس کے دل میں وہ جذبۂ ایثار پیدا کر دیا جو وفورِ محبت ہی کے بعد ممکن ہے۔

اس نے دفعتہً انگڑائی لی اور مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ نولاکھی ناچتے ناچتے گھبرا کر پیچھے ہٹی اور سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ رام دلارے نے اس کے قدموں کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا:۔

"دیوٹی جی! ہم ہار گئی لیں۔ تہارا ائین ناچ اہ دیس ماں کیہو کا نا آوت ہوا" نے اس پر خوب خوب تالیاں بجائیں اور فقرے کسے۔ اہیروں نے گالیاں دے کے "ہار گو! ہار گوا!" کا شور مچایا۔ مگر نولاکھی نے رام دلارے پر ایک جھلی

نظر ڈالی اور سر جھکائے چپکی اپنے بھونپڑے میں چلی گئی۔ نگاہیں کہتی تھیں کہ رام دلارے کی شکست مان لینے نے جیت کو ہار بنا دیا اور ہار کو جیت!

سپیرے نے ناگن کو جڑی سنگھا کر مدہوش کر دیا تھا اب وہ اس کے قابو میں تھی۔

اس واقعہ کے پندرھویں دن رام دلارے پھیدی پور پھر آیا۔ دن بھر اہیر ٹولی میں رہا شام کو جب رام نگر واپس جانے لگا تو نولاکھی سرخ چادر اوڑھے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اور سکھیاں بابل گا رہی تھیں۔ مگر رام دلارے کا انداز نرالا تھا۔ وہ بائیں کاندھے پر لاٹھی رکھے اسے الٹے ہاتھ سے سنبھالے تھا اور داہنا ہاتھ کبھی کان پر کبھی کولہے پر رکھتا اور مستانہ وار ناچتا اور گاتا جاتا تھا:

رام رام کی بھجن کرو، رام پر دھرو دھیان
محرم ہوئے وہی پہچانے، ایسا جوڑ ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے اپنی ہر بیٹھے ایسا موہن پیارا ہے
انکھیاں اہ کی کھنجر ایسی، چلیا وہ تی دھارا ہے
دیکھو نیچے اہیر دیکھو، اسی ہی ہمرا پیارا ہے

---

۱ دیوی میں ہار گیا تمہارا سا ناچ اس ملک میں کسی کو نہیں آتا۔

۲ رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔ میرے کنھو کو سوائے خاص خاص لوگوں کے ہر ایک نہیں پہچان سکتا۔ وہ جہان جانی ہے اپنی موہنی اور پیاری صورت کی وجہ سے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اس کی آنکھیں خنجر ہیں اس کی چال میں دریا کی روانی ہے اے نیچے اوپر دیکھو ہی ہری پیاری ہے اسی سے ہار کے میں نے اسے جیت لیا یہی ترکیب سب سے زیادہ کارگر تھی۔ ایسی چالیں سوائے رام دلارے کے دوسروں کو نہیں آتیں (یہی تو وجہ ہے کہ میرے کنھو کو بھی سوائے مخصوص لوگوں کے ہر کس و ناکس نہیں پہچان سکتا (اور اسی لیے فرض ہے کہ رام رام کرو اور اس کا دھیان کرو۔)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی سے ہار کے اوکے جیتا، یہی گھاٹ کٹارا ہے
ایسی گھیتا ناکو نی جانے، جانے رام دلارا ہے
مرم وہی پہچانے، ایسا جوڑ ہمارا ہے
رام رام کی بجھن کرد، رام پہ دھرو دھیان

وہ ہر کڑی پر رک کے کھڑا ہو جاتا۔ کولے اور کمر کو حرکت دیتا پھر ناچتا ہوا نولاکھی کے گرد گھومتا اور آگے بڑھتا۔ نولاکھی شرماتی، لجاتی، بدن چراتی، مگر گھونگھٹ سے "تیر نیم کش" مارنے سے باز نہ آتی تھی۔

ہاں ہاں، سپیرے کے منتروں نے ناگن کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ اب اسکے گلے کا ہار تھی۔

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور خلاف معمول ایک بھی ممبر غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم ممبر جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور درد مند سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

"..... اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! اب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ نیم عریاں لبادوں کے بنا سنگار کو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر اُن کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں لونڈوں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُر مسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"..... اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ ہمارے نونہالانِ قوم جو دس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا۔ انھیں بھی صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑ جاتا ہے۔ یہ محتاجیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگار کئے باہر پر بے حجابانہ نگاہ دعوت حسن دیتی ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار جوانی کے نشے میں سود و زیاں سے بے پرواہ نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پُر اسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا....."

اس موقع پر ایک رُکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے، اور اساتذہ کے شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے:

"صاحبان واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈبوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رُکن نے جو چشمہ لگائے تھے اور ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے [illegible] کرتے ہوئے کہا: "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز عفت، شرافت، [illegible]

نجکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے، منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جادۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رُکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے۔ اور جنہوں نے سرد و گرم دیکھ چکے تھے۔ اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقیماندہ زندگی آسودگی سے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایہ میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے۔ تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے "صاحبان رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ۔ ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، اگالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا ہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں ضبط کی جان آ گئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے....."

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کا مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گذرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بڑدبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں۔ کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لیے باعث صد عار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے "حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے۔ اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان کی شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا۔ اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے۔ اور انہیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھگتیں۔ مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصہ میں وہ علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے، یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھرتے دیکھے گئے تھے۔

بالنسوے کچھ اور بیواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دلبستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں۔ اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے پر نامزد استہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بقاہر یا نا کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کوٹھوں کھنڈوں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انھیں اچھے وصول ہو گئے تھے۔ اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو قریبی چھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی زمین کے قطعے صاف کرائے اور چار پانچ درجن نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوا گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور مٹی، حمام، کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا۔ اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتی۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے۔ اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گذاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہوگئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی۔ دو ڈھائی سو اج، مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سنکر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا۔ اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چوترا بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک لوٹکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے لو خربوزے شہد سے میٹھے خربوزے کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا۔ گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا۔ تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس کے آ موجود ہوا۔ اور اسی بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، منشی، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا۔ اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنجورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا۔ اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کو اٹھائے آجاتا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے بخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نامی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آجاتا۔

ان بیواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں۔ اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں۔ اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش دیکھا دیکھی کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے۔ اور اگر اس دن بیواؤں

بھی آمنی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے۔ بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں پہلے ہی دن سے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف کہاگہی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی میں ان بیواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی۔ اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتیں تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس دھواں اٹھ رہا ہے۔ اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چارابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر۔ ہاں اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑے کر کنویں پر آیا، اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائینتی چراغ روشن کر دیئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چھ مہینے گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رُخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کرسی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگِ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا۔ اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا جب سنگِ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شنبہ دن اسی بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبوئیں ہیں کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع کے پاس بھی نہ ہوتے ہونگے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا۔ اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دُور دُور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا۔

اُن کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوؤں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے تو دل سیاہ فام سازندے زلفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے، عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے۔ اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پَر سے ہلکے باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنیں اٹکھیلیوں سے چلتیں، رات بھر رقص اور سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری، جو کھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے۔ اور قرینے سے کمروں میں لگنے لگے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضبح جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے سونے میں گذارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے۔ اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں نہاؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتی۔ آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں ہنستیں کھلکھلاتیں جب کھڑے کھڑے تھک جائیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چہلیاں کرتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہو جاتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز قلفل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکان دار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پورا کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے نمبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر اس نے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ تین تین چار چار پیکٹوں بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں پانوں کی ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار بچوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیرفروش، چوتھی میں فصائی، پانچویں میں قصابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا۔ اور یہاں خاصے منافے پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا۔ اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال ایک ایک دکان پر لے جاتا۔ اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا۔ اور حقے کے دم بھی لگا آتا جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی۔ اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گذر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا۔ اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان ایک بیوہ کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا۔ اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکتے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے بونڈر، قسم قسم کا پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فیتے، خوشبودار تیل، رومال منجن، کی خوب بکری ہونے لگی

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آپناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے۔ اور اس بستی میں ایک دوکان کرایہ پر لے لی سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب البرقرا بادین قدیم اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیوار میں جو جگہ خالی بچی۔ وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو حبیواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آموجود ہوتے اور شربت بزوری شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور تازہ بخش، روح افزا شربت وعرق، خمیرہ گاؤزباں اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں ان حبیواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کرتے تیتروں سے "سبحان تیری قدرت کی رٹ" لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔ ایک حبیوا کے سازندے نے ایک دوکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو

ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دوکان دار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آجاتے اور دیر تک بیٹھے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی، جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض حبیواؤں کے گھروں سے بھی مسجد میں پڑھنے آنے لگے جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گونیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرایہ اور اپنی بے مانگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رخ کیا۔ اور ان حبیواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں ٹینٹ کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر ایکٹرسی کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ڈریس بھی اچھے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور وغل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ہنستے بولتے، بانسری اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گلوچ بکتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے۔ نئی بستی کو شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پھوپھا تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگے کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن بجاتے۔ اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا۔ اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر بٹھانے، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے ہوئے اس پراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی دگنا دوگنی رات ہو گئی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس

کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان بیواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں۔ اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکان دار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی۔ مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاکخانہ کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھے بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹر بمشکل دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا۔ تاکہ تماشائی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آجائیں۔ تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں ان کے ساتھ بستی کے لوگ بھی سستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سنتے کنٹورا بجاتے اس باغیچہ میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو دار والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے، دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے دوسرے مرلیوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوا لیں۔ مکان میں ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے۔ اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے پاس ہی ایک دوکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آڈیرا جما ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے۔ اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کی دغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن لگا.....

اس واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خا

آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بینک جن میں سے دو دو نیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم سالے، چھ تعلیم خانے، پانچ انا تھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حسن آباد" کے "حسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا۔ کیونکہ عوام حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے اور بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی!"

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت حصہ بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں یہ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنان بازاری شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی ....."

اس مرتبہ ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

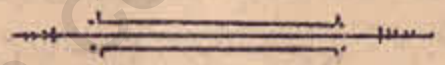

کرشن چندر

جھیل سے پہلے، جھیل کے بعد

جو سڑک سری نگر سے گل مرگ کی طرف جاتی ہے۔ وہ دور تک شہتوت کے خوبصورت پیڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ سڑک دھان کے کھیتوں کے بیچ میں سے گذرتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کی نرم رَوِیاں دھان کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ کھیتوں کے کنارے جہاں کہیں کوئی کھڑا ہے یا چلتا پھرتا تھم سا گیا ہے وہاں کنول اور نیلوفر کے پیالے کھلے ہوئے ہیں۔ سپید، گلابی، زرد، کہیں کہیں چناروں کے نیچے گڈریئے گائیں بھیڑیں چرا رہے ہیں۔ چار چار عورتوں کی ٹولیاں گیت گاتی ہوئی دھان کوٹ رہی ہیں۔ ایک عورت سر پر گھڑا اٹھائے پانی بھرنے جا رہی ہے۔ لاری کو دیکھ کر یونہی بلاوجہ شرما پڑتی ہے۔ اس کے موتیوں سے سپید دانت بہت عرصہ تک آنکھوں کے گرد خیال میں لرزتے رہتے ہیں۔

جو سڑک ٹنگ مرگ سے گل مرگ کو جاتی ہے وہ صرف تین میل لمبی ہے سڑک پر انگریز مرد اور عورتیں عمدہ گھوڑوں پر سوار نظر آتے ہیں۔ ان کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیچھے پیچھے بھوری رنگت والے کشمیری ہانوبا بنتے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں کسی کے ہاتھ میں ٹوکری ہوتی ہے کسی کے ہاتھ میں ٹھرماس تو کسی کی گردن پر کسی میم صاحب کا بچہ مرد تسمپا کی طرح سوار ہوتا ہے۔ مزدور اپنی کمر پر ڈھائی من کا اسباب اٹھائے جھکے ہوئے چڑھائی چڑھتے جاتے ہیں۔ وہ پنجابیت والوں کے وہ مقولے نہیں پڑھ سکے جو ٹنگ مرگ میں آتشک اور سوزاک کی دواؤں کے اشتہار کی طرح جا بجا لگے ہوئے ہیں "مزدوری میں عزت ہے" "مزدوری سے عار نہ کرو" "مزدوری کرنا سیکھو" اس سڑک کے دورویہ چیل اور دیودار کے تناور درخت ہیں جن کے پاؤں میں سفید چھتریاں اور مکھیں اُگی ہوئی ہیں بنفشے کے پھول ہیں۔ سرپڑی کا سبزہ اور کسی دیودار پر شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے ہیں۔ اور سارا جنگل ان کی مدھم آواز سے گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس شہد میں جنگلی پھولوں کی حلاوت ہوتی ہے۔ اور وہ مقوی وٹامن جسے تیار کرتے وقت ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔

دو ننھے کشمیری لڑکے اس سڑک پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ گل مرگ سے نیچے ٹنگ مرگ کو جا رہے ہیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں انڈوں کی ٹوکریاں تھیں۔ انڈے جو بکے نہیں۔ دونوں بہت اداس معلوم ہوتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں "انڈے چاہئیں" "نہیں!" تھکے تھکے قدموں سے چل رہے ہیں۔ شاید گھر پہنچ کر ماں باپ بھی ناراض ہونگے۔ شاید کھانا نہ ملے صرف چانٹے ہی ملیں۔ سڑک کے نیچے بہت دور تک شور مچاتا ہوا فیروز پور نالہ بہہ رہا ہے، نیلا نیلا جس میں سفید سفید جھاگ ملی ہوئی ہے۔ نیلا جیسے ان کشمیری لڑکوں کی آنکھیں جس میں سفید سفید جیسے لاری کی طرف دیکھتی ہوئی کشمیرن کے دانت۔ لیکن انڈے پھر بھی نہیں بکے۔

دس بارہ کشمیری لڑکیاں پیالی نما ٹوکریوں میں جنگل سے لکڑیاں اٹھا رہی ہیں۔ ان بڑی بڑی ٹوکریوں میں ٹنگ مرگ کے رہنے والے سیاحوں

اور تپ دق کے مریضوں کے لیے لکڑیاں چن کر لا رہی ہیں۔ ان میں کئی لڑکیاں تپ دق کے مریضوں کی طرح کھانس رہی ہیں۔ کیونکہ لکڑیاں اٹھاتے وقت جسم جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ ان لڑکیوں کی ٹانگیں بچپن ہی سے بھرکر بے ڈول ہو جاتی ہیں۔ چال میں ناہمواری، رخساروں میں گڑھے اور چھاتیوں میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں کبھی جوان نہیں ہوتیں۔ پہلے تو محض لڑکیاں ہوتی ہیں اور پھر ایک دم مائیں بن جاتی ہیں۔ جوانی کیا ہے۔ رس کیا ہے۔ جنگل میں شہد کی مکھی کس لیے پھولوں کی حلاوت جمع کرتی ہے۔ گلاب کیوں مہکتے ہیں مکھن پیالوں کی زرد زرد ہیٹیاں تھمتے ہوئے پانی پر کیوں لرزاں رہتی ہیں۔ انھیں ان باتوں کی سمجھ نہیں۔

جو سڑک نو ہزار فٹ کی بلندی پر گل مرگ کی وادی کے پیالہ کے گرد ایک زرکار ربیتے کی طرح گھومتی جاتی ہے اسے سرکلر روڈ کہتے ہیں۔ یہاں سے سارے کشمیر کی وادی دکھائی دیتی ہے۔ سینکڑوں میل کا وسیع و عریض میدان اور چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جبکہ ابھی انسان پیدا بھی نہیں ہوا تھا ان پہاڑوں نے ایک نیلی جھیل کو گھیر رکھا تھا۔ چاروں طرف برف کے گلیشیر ہوں گے اور بیچ میں یہ جھیل جس کے نشان ابھی ڈل، ولر اور مانس بل کی جھیلوں میں ملتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اب بھی وہی پرانی جھیل ہے، وہی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میں ہی وہ پہلا آدمی ہوں جو اس پُراسرار مافوق الفطرت منظر کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر وہ جھیل کا پانی جیسے ایک دم کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ اور وادی کا سبزہ اور اس کے مرغزار اور اس کے گاؤں اور شہر آنکھوں کے آگے پھیلتے جاتے ہیں۔ دیودار کا سناٹا فیروز پور نالے کے شور سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے اور زندگی ہزاروں سال آگے کی طرف لوٹ آتی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس سڑک پر میری ملاقات ایک آئرش لڑکی سے ہوئی ہے۔ نام ہے (Lira O Connor) لیرا اوکانر۔ لیرا کی آنکھیں نہ نیلی ہیں نہ بھوری۔ نہ سبز۔ بلکہ ان تینوں سے ملتا جلتا ہوا کوئی اور رنگ۔ لیرا کی آنکھوں میں ایک عجب موہنی ہے۔ جیسے یہ آنکھیں ہمیشہ پیچھے ہی دیکھا کرتی ہیں۔ لیرا کے بالوں کا رنگ پلاٹینم جیسا ہے۔ نازک، مہین، ریشمیں، ان کے گرد اس نے ایک طلائی رومال باندھ رکھا ہے۔ وہ آرام سے بیٹھی درمیانہ دیواروں کے چھتنار کے سائے میں ایک گھاٹی کا اسکیچ بنا رہی ہے جہاں درختوں کی پھننگوں کا ایک جال سا بنا ہوا ہے۔ اور جس کے آخر میں ندی کے پانی کی ایک لکیر کھینچ گئی ہے۔

"یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اپنی راہ دیکھو"

میں نے اطمینان سے کہا "یہاں سبز رنگ زیادہ گاڑھا ہے۔ پھولوں کے تختے اور دیواروں کے جال کا تناسب صحیح نہیں۔ خصوصاً یہاں تو۔"

"بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ٹھیک کرتی ہوں ..... کیا تمہیں واٹر کلر کا شوق ہے؟"

"مجھے واٹر کلر سے عشق ہے۔ یوں سمجھئے کہ ابھی عشق ہوا ہے۔"

لیرا مسکرائی۔ اور پون گھنٹہ خاموش بیٹھی اسکیچ بناتی رہی۔

"مجھے بھوک لگی ہے اور میرے پاس صرف یہ چند بسکٹ ہیں" لیرا نے ایک بسکٹ لبوں کے درمیان رکھتے ہوئے کہا "لیکن" میں نے کہا۔ میرے پاس یہ بھنا ہوا مرغ ہے۔ اس تھرموس میں۔ اور چند چپاتیاں بھی ہیں۔ اگر تمہیں ہندوستانی کھانے سے نفرت نہ ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو ——"

وہ شوق سے کھانے لگی۔ پھر بولی "اس میں Chillee بہت زیادہ ہیں۔ نہ جانے تم لوگ مرچیں اس قدر کیوں پسند کرتے ہو؟"

یہ کھانے کا ذائقہ دوچند کر دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی جہاں اور ہر ایک حس مر چکی ہے وہاں ذائقہ کی حس ابھی برقرار ہے بلکہ متواتر غاتوں سے یہ حس اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ اس لئے سرخ مرچیں ——"

"نہ جانے تم لوگوں میں یہ کیا عادت ہے" اس نے اپنے پلاٹینی بالوں کو جھٹکا کر کہا "کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات کرو۔ وہ ہر پھر کر سیاست پر آجائے گا۔ میں نے سرخ مرچوں کا ذکر کر دیا تھا تم اپنے وطن کی سیاست کا ذکر لے بیٹھے۔ نہ جانے کیا بات ہے!....."

اس کے سرخ لب غصہ سے خمیدہ ہو گئے تھے۔

میں نے کہا "چلو، سرخ مرچوں کے ذکر کو جانے دو۔ آؤ سرخ لبوں کا ذکر کریں۔ ان گلاب کے پھولوں کا تمہارے رخساروں پر کھلے ہوئے ہیں۔ ان چاند کی کرنوں کا جن سے تمہارے بال بنے ہیں۔ ان سپنوں کا جو تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں کانپ رہے ہیں۔ جیسے کسی خاموش جھرنے کی سطح پر ترنا ری کے لہراں ولرزاں پھول!"

..... دوسرے دن شام کو گل مرگ کے بازار میں لیرا اوکانر گھوڑے پر سوار چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اس نے مجھے لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکی مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب!.....

جو سڑک گل مرگ کی وادی کے بیچوں بیچ جاتی ہے۔ وہ گالف کورس کو درختوں میں قطع کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف انگریز مرد اور عورتیں گالف کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اور کشمیری ہاتو گالف کے سامان کے جھولے اور چھڑیاں اٹھائے ان کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اس سڑک پر گل مرگ کا کلب ہے۔ اور آگے چل کر عین وسط میں ایک اونچی جگہ پر امپیریل بنک اور ہنڈوز ہوٹل جاگیردارانہ نظام میں اور اس سے پہلے جو اہمیت دھرم اور معبد خانہ کو تھی، اس مہاجنی نظام میں وہی اہمیت ہوٹل اور بنک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کو حاصل ہے۔ نئے نظام کے نئے مظہر بچاری البتہ وہی ہیں۔

اس سڑک پر انگریز نما ہندوستانی گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں۔ کشمیری نوکر سرخ شلغم اور پیاز کے گٹھے اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انڈوں کی ٹوکریاں، مٹن، مٹر اور پھل اٹھائے لے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ان کے کھانے کے لیے نہیں ہیں۔ صاحب لوگوں کے بچوں نے ہیٹ پہن رکھے ہیں اور قیمتی اونی سوئٹر۔ میم صاحب لوگوں نے کارڈ مخمل کی بیش قیمت پتلونیں پہن رکھی ہیں جنہیں گل مرگ کشمیری درزیوں نے سیا ہے۔ لیکن یہ لوگ ان پتلونوں کو بھی نہیں پہن سکتے۔ یہ لوگ صرف مزدوری کر سکتے ہیں جیسا کہ پنچایت کا فرمان ہے "مزدوری میں عزت ہے" "مزدوری میں عزت ہے" "مزدوری میں عزت ہے"۔ اسی سڑک پر ایک ہاتو بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جوتے مرمت کرنے والا ہے۔ اور ایک گداگر۔ وہ خود پیلی پکی ہوئی ہاڑیوں کی ایک ٹوکری سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ یہ ہاڑیاں وہ اپنے کھیت کی مینڈھ پر اگے ہوئے ہاڑی کے درخت سے اتار کر لایا ہے۔ اس کے کھیت میں جو اناج تھا اسے زمیندار، بنئے اور حکومت نے رہن رکھ لیا ہے۔ اب دو تین ہاڑیوں اور سیبوں کے درخت باقی رہ گئے ہیں وہ ان کا پھل گل مرگ لے جا کر بیچتا ہے۔ تاکہ وہ صاحب لوگوں کو ہاڑی اور سیب کھلا کر اپنے بیوی بچوں کے لیے کچھ تھوڑے سے چاول خرید سکے۔ گداگر آلتی پالتی مارے بے حیائی سے پیسہ مانگ رہا ہے۔ جوتہ مرمت کرنے والا ایک ایسا جوتہ مرمت کر رہا ہے جس کی قیمت پچاس روپے سے کم نہ ہوگی۔ خود اس کے اپنے پاؤں ننگے ہیں۔ تلووں میں بیاں پھوٹ آئی ہیں۔ اور ایک جگہ سے خون بھی بہہ رہا ہے۔ لیکن جوتوں کی

نوخیز قیمت بھی ہوتی ہے بھلا اس خون کی کیا قیمت ہوگی۔

ایک بوڑھی انگریز عورت اپنی زنگین چھتری گھما گھما کر اپنے ساتھ چلنے والی دوسری عورت سے کہہ رہی ہے "ماتی ڈیر تمہیں معلوم نہیں کہ جب وہ ہندوستانی ہمارے کمرے میں گھس آیا تو مجھے کتنا ڈر معلوم ہوا۔ ڈر اور غصہ میں بھاگ کر دوسرے کمپارٹمنٹ میں اپنے خاوند کے پاس چلی گئی..."

آج بہت دنوں کے بعد میں پھر اس سرکلر روڈ پر سیر کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ یہ جنگل بالکل خاموش ہے۔ کشمیر کی وادی پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے اور گھٹتی ہوئی روشنی کی ایک مسلسل شطرنج سی بنتی جا رہی ہے۔ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ اس وادی کی قسمت کیوں خاموش ہے۔ یہ جنگل اپنے بیٹے بیٹیوں کے لیے بھی نہیں بولتا۔ اس جنگل کا شہد، اس کے اخروٹ، اس کے سیب، انگور، اس کا ریشم، اس کی ساری خوبصورتی اور غنا تی اس کی کوئی چیز بھی اپنے بیٹوں کے لیے نہیں، یہ کیسی خدائی ہے؟ یہ جنگل کیوں خاموش ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا "مزدوری نہ کرو" "کارڈ مخمل کی پتلونیں پہنو۔ سیب کھاؤ۔ خوبانی اور اخروٹ کھاؤ۔ مزدوری کرنے سے انکار کر دو۔ گھوڑے کی سواری کرو۔ دندناتے پھرو۔ یہ زمین تمہاری ہے یہ آسمان تمہارا ہے۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو آؤ ساری وادی کو ایک جھیل بنا دیں۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی جھیل جس میں ٹھنگ مرگ اور گل مرگ سب سما جائیں جس کے پانیوں میں انسانی بے رحمی کے جنمی اور وحشی گھروندے سب فنا ہو جائیں۔ بس چاروں طرف وہی پرانی جھیل ہو، ہزاروں لاکھوں سالوں کی جھیل اور اس کے چاروں طرف وہی برف کے گلیشیر اور برف سے لدے ہوئے پہاڑ کھڑے ہوں۔ تاکہ جب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آسمان کی پہنائیوں سے سورج کی پہلی کرن جھیل کی سطح پر اترے تو مسرت سے چلا اٹھے "شکر ہے ابھی انسان پیدا نہیں ہوا"

ممتاز مفتی

ماتھے کا تل

"میں آگیا بھابی" سعید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "سلام علیکم۔ طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

"اوہو! تم ہو سعید" بھابی نے آنکھ اٹھا کر کہا "کیسے آئے ہو؟"

"بس آگیا ہوں۔ دو دن کی چھٹیاں تھیں" میں نے کہا چلو بھابی سے مل آؤں۔ بھائی جان کہاں ہیں؟"

"دفتر گئے ہیں۔ کہو خالہ کا کیا حال ہے"

"بہت بہت پیار دیتی ہیں۔ کہتی تھیں کسی روز ہم سب ملنے کو آئیں گے!"

"وہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی تمہیں؟"

"تکلیف! اوہ، کیا بتاؤں بھابی۔ بے حد تکلیف ہوتی مجھے" سعید نے دیوار کی طرف منہ پھیر کر مسکرا دیا۔

بھابی مشین چلاتے چلاتے رک گئی "تکلیف ہے تو وہاں رہنے کی کیا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ضرورت ہے۔ واپس بورڈنگ میں چلے جاؤ۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان کے گھر میں اتنے لوگ ہیں اور اتنا سا مکان ہے۔ پھر تمہارا آخری سال ہوا تمہیں تو ایک علیحدہ کمرہ چاہیے۔"

"عجیب مصیبت ہے۔" سعید نے منہ بگاڑ کے کہا۔ اور ایک آہ بھری۔

"آخر ہوا کیا۔ میں بھی تو سنوں۔"

"نہیں تم خفا ہوگی۔"

"تم کہو!"

"وعدہ کرو کہ ناراض نہ ہوگی۔"

"ہاں اب بتاؤ۔"

وہ اٹھ بیٹھا اور بے تابانہ ادھر ادھر گھومنے لگا۔ "یعنی بالکل ہی بتا دوں۔ کیوں بھابی؟"

"کچھ بتاؤ گے بھی یا نہیں۔ کیسی عجیب عادت ہے تمہاری۔" بھابی جھنجھلا کر بولی۔

"کہہ تو رہا ہوں تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو۔ مجھ جیسے فرمانبردار سے ناراض ہونا۔ اچھی بھابی ـــــ قصہ یہ ہے۔ یعنی۔ مجھے اپنی ہونے والی بیوی مل گئی ہے۔"

"کیا کہا کون مل گئی ہے؟"

"میری بیوی۔ یعنی میرے اوپر راج کرنے والی۔"

"بس تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔" بھابی مسکراتے ہوئے بولی

"ایمان سے بھابی مذاق نہیں تمہاری قسم۔"

"کون ہے وہ؟"

"تسلیم۔" سعید نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا۔

"کون تسلیم! خالہ کی لڑکی؟ ـــــ پر یہ بھی جانتے ہو کہ خالہ نے سن لیا تو

مار مار کر گھر سے نکال دیں گی!"

"جبھی تو کہتا ہوں عجب مصیبت ہے۔"

"پر وہ ابھی بچہ ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ بالکل چھوٹی سی تھی۔"

"اب تو وہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ وہ۔ بس تمہارے جتنا ہی قد ہوگا۔ جب میں نیا نیا وہاں گیا تو ایک عجیب واقعہ ہوا پہلے پہل تو میں عام طور پر بیٹھک ہی میں رہتا تھا۔ البتہ چھوٹا ماموں اور جاجی اکثر میرے پاس آ جایا کرتے تھے۔ ماموں تو دو ہی دن میں میرا دوست بن گیا۔ بڑا تیز لڑکا ہے وہ۔ دوسرے دن خالہ آ گئیں۔ کہنے لگی چلو بیٹا اندر چلو نا تم تو بیٹھک کے ہی ہو رہے ہو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تم سے کیا پردہ کرے گا کوئی۔ اس روز تو میں چار ایک منٹ اندر بیٹھا پھر باہر آ گیا۔ اگلے دن خالہ نے پھر مجھے بلا بھیجا کہ چلو۔ ماموں اور جاجی بھی آ گئے۔ خالہ بھی بیٹھی رہیں بڑی باتیں ہوئیں اس روز۔ پھر جب میں دیوان خانے کی طرف جا رہا تھا تو وہ میز کے پاس کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ بالکل اسی طرح ذرا سی بائیں طرف کو جھکی ہوئی ایسے ہی لانبے لانبے بال تمہارے جیسے۔ خدا کی قسم میں تو حیران رہ گیا۔ میں سمجھا شاید بھابی آ گئی ہے۔ اور جیسے میری عادت ہے میں نے قریب جا کر کہا "آخر ہم نے پہچان ہی لیا نا کیوں بھابی؟" اس نے جو مڑ کر دیکھا تو میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ تو سنگر ہے اس وقت کمرے میں کوئی تھا نہیں ورنہ بڑی ہوتی۔ پر بھابی حیرانی ہے کہ اس کی شکل بالکل تمہارے جیسی ہے۔ ایسا ہی چوڑا ماتھا۔ اور ـــــ اور یعنی بالکل ہی تمہارے جیسی۔ بس صرف اتنا فرق ہے کہ تمہارے ماتھے پر کالا تل ہے نا اس کے ماتھے پر نہیں۔ باقی ہو بہو گویا تم ہی ہو۔"

"بڑی گپیں مارنی آتی ہیں تمہیں چھوڑو ابھی قصے اور جا کر نہاؤ۔ معلوم ہوتا ہے سفر کی کوفت سے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں رہا۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"او بھابی۔ بس تم تو میری ہر بات کو مذاق ہی سمجھتی ہو" بھابی خاموش بیٹھی مشین چلاتی رہی۔

"اب تو میری صرف ایک آرزو ہے بھابی۔ دُنیا میں صرف ایک تم ہو جس کے لیے میرے دل میں عزت ہے۔ اور ایک وہ ہے جس سے مجھے "وہ" ہے۔ صرف اتنی آرزو ہے کہ تم، میں اور وہ اکٹھے رہیں"

"تم اور وہ تو ہوتے نا۔ میرا نام خواہ مخواہ" بھابی مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم بڑی وہ ہو بھابی۔ جو مجھے ستاتی رہتی ہو۔ دیکھو نا سوا تمہارے میرا کون ہے۔ اماں تو میں نے دیکھی نہیں چھوٹا سا تو تھا ان دنوں۔ بس تم ہی تم ہو اور ہے ہی کون۔ مجھے یاد ہے جب تم نئی نئی آئی تھیں اور مجھے گود میں بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر اکثر رات کو جب تم مجھ پر رضائی ڈالنے کے لیے جھکتی تھیں تو میری آنکھ کھل جایا کرتی تھی آنکھ کھولتا تو تمہارا بڑا سا چہرہ اور چوڑا سا ماتھا اور اس کے درمیان میں کالا سا تیل دکھائی دیتا۔ وہ نقشہ اب بھی میری آنکھوں تلے پھرتا ہے۔ گویا دل پر نقش ہو گیا ہو۔ کیوں بھابی یاد ہیں تمہیں وہ دن؟"

"ہاں یاد ہیں۔ ان دنوں تم اتنے سے تھے۔ لیکن اب تو ایک دم اتنے بڑے ہو گئے"

"پر تمہارے لیے تو اتنا سا ہی ہوں"

"اب تو بڑے شیطان ہو گئے ہو تم"

"یہ کیا نئی بات ہے بچے۔ تو ہوتے ہی شیطان ہیں۔ کیوں بھابی ہے نا یہ بات؟"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ جاؤ جا کر نہا لو۔ دیکھو تو جب سے آئے ہو تم ذرا کام نہیں کرنے دیا تم نے"

"اچھا بھابی جیسے بھی تم کہو" سعید نے بھابی کو ایک فوجی سلام کیا۔ اور پھر

کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگا۔ کپڑے بدل کر وہ وہیں سے چیخنے لگا "ایک بات یاد آ گئی۔ سناؤں بھابی۔ بڑے مزے کی بات ہے؟"

"کیا ہے؟" بھابی نے مشین چلاتے ہوئے سرسری طور پر کہا۔

سعید دروازہ کی چوکھٹ پر آ بیٹھا۔

ایک دن میری طبیعت خراب تھی۔ اس لیے میں چادر لپیٹ کر برآمدے میں سو گیا۔ شاید اس نے سمجھا کہ خالو پڑے ہیں۔ شاید خالہ نے کچھ کہنے کے لیے بھیجا ہو۔ اُسے بس جی وہ آئی، جھک کر میرے منہ سے چادر ہٹائی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اس کا بڑا سا چہرہ اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر معاً میرے منہ سے نکلا "کیوں بھابی؟" اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس بات پر بڑا مزہ رہا۔ اس کا منہ لال ہو گیا۔ اور وہ بھاگی۔ اُدھر خالہ نے سُنا تو ہنس ہنس کر لوٹ ہو گئیں۔ اندر جا کر چیخنے لگیں "اماں! دیکھو تو باجی کو کیا ہوا ہے۔ الماری میں منہ ڈال کر آپ ہی آپ ہنس رہی ہے۔ ضرور میرا گیند چھپا دیا ہو گا اس نے۔ کچھو بھاگی بھاگی ان کے پاس آئی اور ایک عجیب سے انداز میں گاتی ہوئی "ہاتھ پھیلا کر گھومنے لگی "بہت بڑی ہوئی بھائی جان سے" خالہ تو ہنسی کے مارے منہ میں پلو ٹھونس کر اٹھیں۔ یعنی واقعی بڑی بڑی ہوئی ہم سے اس روز!"

"اچھا اب باتیں ہی بناتے رہو گے یا نہاؤ گے بھی" بھابی اپنے ماتھے پر گھومنے والی تیوری چڑھا کر بولی۔

"اچھا تو لو چلے جاتے ہیں ہم۔ اور وہ غیر کے پاؤں پڑ گیا بخود نہ نہانیں، ہوا غسل خانہ میں جا داخل ہوا۔

بھابی کام کرتے ہوئے آپ ہی آپ کہنے لگی "میں کہتی ہوں تسلیم کی تو منگنی ہو چکی ہے۔ شاید نہ جانے میں نے کہاں سے سُنا تھا" اس نے بآواز بلند کو آواز دی "سعید؟"

"مجھ سے کہا ہے کچھ؟" سعید نے غسل خانہ سے شور مچایا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"کہہ رہی ہوں کہ تسلیم کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔"

"سچ؟" سعید نے گھبرا کر پوچھا۔ "نہیں، ناحق مجھے ستا رہی ہو بھابی۔"

"ایمان سے سچ کہتی ہوں اجلے کس نے بتایا تھا مجھے، ہاں تمہارے بھائی کہہ رہے تھے، جب وہ بمبئی سے آئے تھے۔ ان دنوں خالو بمبئی میں کام کرتے تھے نا۔ اور تمہارے بھائی اُن ہی کے ہاں رہتے تھے۔"

"مجھے تو معلوم نہیں۔ مجھ سے تو انھوں نے بات نہیں کی۔"

"شاید پھر بات بنی ہی نہ ہو۔ ہم نے بھی اڑتی اڑتی سی سُنی تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔" سعید ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "تم بڑی وہ ہو بھابی۔"

"بہت گستاخ ہو گئے تم۔ آئیں تمہارے بھائی اُن سے کہہ کر پٹوائیں گی۔"

"اوہ! وہ ضرور مانیں گے تمہاری بات۔"

"انھیں بتاؤں گی نا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہ چھوٹے میاں لاہور میں ایک اپنی "وہ" بنا آئے ہیں۔"

"خدا کے لیے بھابی یہ نہ کہنا اُن سے۔ بڑی اچھی ہے بھابی میری۔" سعید نہاتے ہوئے بھابی کی منتیں کر رہا تھا۔ اور وہ چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہی۔

نہا کر وہ سیدھا بھابی کے پاس گیا۔ "بڑی اچھی بھابی ہے ہماری۔ ذرا سی گانٹھتی ہے۔ ویسے بڑی اچھی ہے۔"

"اوں ہوں! میں تو ضرور کہوں گی ان سے۔" بھابی نے منہ پھلا کر کہا۔

"نہیں خدا کے لیے۔" سعید ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ہنس پڑی۔ "یہ لڑکا تو اس کے دھیان میں اپنے آپ سے بھی جاتا رہا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔" سعید نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن سعید اسے بھی خبر ہے یا صرف تم ہی مجنوں ہو رہے ہو؟"

"نہیں کیا پتہ بھابی کہ اسے کیا ہے۔ بس نہ پوچھو۔" وہ اٹھ کر بیچینی سے ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"میں بھی تو سنوں!" بھابی مشین چلاتی ہوئی بولی۔

"مثلاً کل ہی کی بات ہے۔" اس نے بھابی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے جی میں آئی کہ کوئی شرارت کروں۔ وہ باہر دھوپ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ جاجی اور مانی بھی پاس بیٹھے کچھ کچھ کر رہی تھی۔ اور خالہ اندر برآمدہ میں تخت پوش پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے توے کی سیاہی انگلی پر لگالی اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "یہ تمہارے ماتھے پر کیا لگا ہے؟" میں نے کہا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے اسے پونچھنے کے بہانے اس کے ماتھے کے درمیان میں انگلی سے کالا ٹیکا لگا دیا۔ یہ دیکھ کر مانی چلایا "باجی ہندو بنا گئے اور جاجی ہنسنے لگے۔ باہر آ کر میں دروازہ سے دیکھتا رہا۔ خالہ نے نماز سے فارغ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور انگلیں مسکرائیں۔ پھر مانی کو ڈانٹ کر بولیں "کیا شور مچایا ہے تم نے؟"

مانی بولا "اماں دیکھو تو باجی کے ماتھے پر!"

"کیا ہے اس کے ماتھے پر؟" خالہ نے منہ بنا کر کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں فضول۔"

"پھر شام کو جو میں اندر گیا تو وہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ ماتھے پر وہ کالا ٹیکا جوں کا توں لگا تھا۔ اتنے میں مانی دوڑتا ہوا آیا۔ "بھابی جان مجھے بھی ہندو بناؤ میں بھی ہندو بنوں گا۔"

"ہندو بناؤں!" میں نے بناوٹی تعجب سے کہا۔ "وہ کیسے؟"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وہ ماتھے پر انگلی رکھ کر کہنے لگا "یہاں لگا ہوا تھا جیسے باجی کو لگا یا تھا"۔
اس نے نیچی نظروں سے گھور کر مانی کی طرف دیکھا۔ اور پھر آنکھیں جھکا کر یوں بیٹھ گئی کہ ٹیکا صاف دکھائی دے۔ یعنی اس روز وہ سارا دن ویسے ہی پھرتی رہیں۔ اگرچہ سارے گھر والے اس پر ہنستے رہے لیکن اس نے وہ ٹیکا نہ مٹایا۔ کیسے مٹاتی وہ ہمارے ہاتھ کا لگا ہوا ٹیکا۔ اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا "اب بولو بھابی۔ مزاج کیسے ہیں؟"

"رہنے دو یہ گپیں۔ جانتی ہوں میں تمہاری باتوں کو"

"اچھا تو ادھر سنو" سعید نے بھابی کی بات ان سنی کر کے کہا "ایک دن مانی بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا "بھائی جان، باجی چوڑیاں پہن رہی ہیں چوڑیاں میں نے ویسے ہی مذاق سے منہ بنا دیا "چوڑیاں! آخ تھو" میں نے کہا "چوڑیاں تو لڑکیاں پہنتی ہیں" میرا خیال ہے اس نے میری بات سن لی ہوگی۔ کیونکہ اگلے دن میں نے اس کی کلائیاں خالی دیکھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ سا ہوا۔ میں نے سوچا جانے کس چاؤ سے چوڑیاں پہنی ہوں گی۔ مجھے اپنی بیہودگی پر بہت غصہ آیا۔ میں نے کچھو سے مخاطب ہو کر کہا کچھو! تم چوڑیاں کیوں نہیں پہنتیں۔ دیکھو تو تمہاری کلائیاں کیسے خالی خالی سے ہیں"

"کل آئی تو تھی چوڑیوں والی" وہ بولی "باجی نے پہنی تھیں" اس نے بھابی کو اپنی کلائیاں چھپا لیں۔

"پھر؟" میں نے کچھو سے پوچھا۔

باجی کو پسند نہ آئیں وہ، اس لیے اتار دیں"

"اوہ، یہ بات ہے" میں نے کہا۔

"میں نہیں لادوں چوڑیاں۔ چوڑیاں خریدنے میں تو مجھے کمال حاصل ہے۔ ایسی لا کے دوں گا کہ بیٹھی اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہو۔ گھر میں جب بھی کسی کو شادی ہوتی ہیں تو مجھ سے ہی کہا کرتے ہیں۔ بس اپنے ناپ کی چوڑی دے دو

دیکھنا"

اگلے دن جب میں اور مانی بیٹھک میں باتیں کر رہے تھے تو مانی چلانے لگا۔ "بھیا بھائی جان" اس نے مجھے ایک چوڑی دکھا کر کہا "یہ کیا تمہاری چوڑی ہے؟"

"اچھا بھابی بھلا وہ کس کی چوڑی تھی؟"

"میں کیا جانوں!" بھابی نے کام کرتے ہوئے کہا۔

"جبھی تو پتا رہا ہوں تمہیں۔ یعنی کوئی وہ چوڑی چپکے سے وہاں رکھ گیا تھا تاکہ میں اس ناپ کی چوڑی لا دوں۔ کیوں بھابی سمجھیں اب ....."

"شاید وہ کچھو کی ہو" بھابی نے کہا۔

"اونہوں" سعید نے سر ہلایا "میں نے کچھو کی کلائی سے ملا کر دیکھا تھا۔ بہت بڑی تھی وہ۔ میں اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اب بھی میرے پاس۔ دکھاؤں؟" وہ اٹھ بیٹھا۔ اور سوٹ کیس سے ایک چوڑی نکال کر بھابی کو دکھا کر کہنے لگا "یہ دیکھو بھابی"

بھابی اسے ہاتھ میں لے کر کچھ دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ بول اٹھی "توبہ کتنا جھوٹ ہے۔ گپ مارنے میں کمال حاصل ہے تمہیں۔ یہ چوڑی تو وہ ہے جو پچھلے مہینے میں نے تمہیں دی تھی۔ کہ اس ناپ کی چوڑیاں لے آنا۔ دیکھو تو بالکل وہی ہے نسیم کے تو بہت ڈھیلی ہوگی یہ۔ میرے اور اس کے ہاتھ میں بڑا فرق ہے"

"کب دی تھی مجھے تم نے؟" وہ حیرانی سے کہنے لگا۔

"یاد نہیں۔ جب تم دس دن کی چھٹیوں میں آئے تھے پچھلے مہینے۔ ہاں۔ بلکہ تمہارے بھائی نے آپ کہا تھا کہ لاہور سے چوڑیاں منگوا لو، یاد آیا؟"

"اوہ!" سعید نے دانتوں تلے زبان دے لی "لیکن بھابی پھر یہ میری میز پر کیسے پہونچ گئی؟"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"کسی بچے نے صندوق سے نکال کر وہاں رکھدی ہوگی۔"

"الاول و الاخر! میں بھی کیا احمق ہوں۔"

"آج پتہ چلا ہے تمہیں!" بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور بھابی میں اسے چھپا چھپا کر رکھتا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے اور....."

"بس رہنے دو یہ گپیں۔"

"خدا کی قسم سچ کہتا ہوں۔ ایک دن کی بات ہے کہ....."

"نا میں نہیں سنتی۔" بھابی نے مسکرا کر کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

"خدا کی قسم آج تو بڑی ہونی ہم سے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھا اور ملحقہ کمرے میں جا کر سوٹ کیس میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ کاغذات میں سے اس نے دو تصویریں نکالیں۔ اور بھابی کے پاس آ کر کہنے لگا۔ "یہ دیکھو بھابی میرے پاس اس کی تصویر بھی ہے۔"

"سچ؟" بھابی بولی۔ "دکھاؤں تو!"

"اوہ، بہت بڑی ہوگئی ہے۔" بھابی نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو کہتے تھے۔ جانے کیا کہتے تھے۔ دیکھو تو اس کی تو اپنی ہی شکل ہے۔"

لیکن اس کے ماتھے پر یہ کالا تل کیسا ہے۔" بھابی غور سے تصویر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں، اس کے ماتھے پر تل تو نہیں۔" سعید بولا۔

"تو یہ کالا سا کیا ہے؟" بھابی نے اسے تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"جانے کیسے لگ گیا ہے یہ مجھے تو معلوم نہیں۔ شاید کسی نے لگا دیا ہو۔"

"آخر لگانے ہی سے لگا ہوگا نا۔ اپنے آپ تو نہیں آ لگا۔ اور تم تو اسے چھپا

چھپا کر رکھتے ہوگے پھر اور کوئی کیسے لگا سکتا ہے۔"

"تمہاری قسم بھابی بڑی احتیاط سے رکھتا ہوں اسے۔ روز سرہانے رکھ کر سوتا ہوں۔ پھر صبح سویرے ہی اٹھ کر دیکھتا ہوں۔"

"اچھا تو اب چھوڑو ان باتوں کو۔ اور اس کے ماتھے سے یہ نقطہ سا کھرچ دو کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔"

"ابھی کھرچ دیتا ہوں بھابی۔"

"نا، ابھی میرے سامنے ورنہ تم بھول جاؤ گے۔ اور اگر تم بھول گئے تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

"اچھی بھابی، تم اتنی سی بات پر خفا ہو جاتی ہو!"

بھابی سعید کے ہاتھ میں ایک اور تصویر دیکھ کر بولی۔ "یہ دوسری تصویر کس کی ہے؟"

"یہ ہے ہماری بھابی کی تصویر۔"

"کونسی؟"

"وہی جو پچھلے سال بھائی جان نے کھنچوائی تھی۔"

"لیکن یہ تمہارے پاس کیسے جا پہنچی۔ اوہ ــــ میں بھی سوچتی تھی کہ صندوق تو میں نے تین کاپیاں رکھی تھیں۔ لیکن اب وہاں صرف دو پڑی ہیں یعنی تم نے صندوق میں سے چرا لی ہوگی۔"

"کیسے نہ چراتا۔ اس کے بغیر میری زندگی مکمل نہیں ہوتی نا۔ بس ایک تم بھابی جی کے لیے میرے دل میں بے حد عزت ہے۔ بس تم، میں اور یہ۔" اس نے تسلیم کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ تمہاری بھوری تینوں اکٹھے ہوں تو میرے لئے جنت ہو جائے۔"

"اچھا چھوڑو ان گپوں کو اور تسلیم کے ماتھے کا تل کھرچ دو۔ سنا تم نے؟"

"یہ لو ابھی جاتا ہوں۔ اس نے ایک فوجی سلام کرتے ہوئے کہا اور ملحقہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کمرے میں جا کر چائے ڈھونڈنے لگا۔

شام کو جب سعید باہر گھومنے گیا ہوا تھا تو اس کے بھائی حمید دفتر سے واپس آئے۔ میاں بیوی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتوں ہی باتوں میں تبسم نے سعید کی بات چھیڑ دی کہنے لگی "اللہ رکھے سعید اب جوان ہو گیا ہے آپ کو اس کی بھی فکر ہے۔ اب بھی اگر آپ اس کی شادی کی فکر نہ کریں گے تو کریں گے کب؟"

"ابھی اسے بی اے تو کر لینے دو" حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

"آخر آپ کی نگاہ میں کوئی لڑکی ہے بھی یا نہیں؟"

"تم تو پگلی ہو تبسم" حمید مسکرا کر کہنے لگا "آجکل وہ زمانہ نہیں رہا کہ جسے جی چاہے لڑکے کے سر منڈھ دیا"

تبسم ان کی بات ان سنی کر کے بولی "خالہ کی لڑکی تسلیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"تم سے تو بس خدا سمجھے۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ کوئی میرا بیاہ کرنا ہے تمہیں پوچھو لڑکے سے۔ ہم تو بس یہی چاہتے ہیں کہ کوئی باعزت گھرانا ہو اور بس!"

"جبھی تو کہہ رہی ہوں۔ خالہ کا گھر تو جانتے ہی ہیں آپ اور لڑکا بھی راضی ہے۔ بلکہ باتوں ہی باتوں میں اس نے آپ مجھے جتایا ہے"

"بس تو پھر مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ لیکن ہاں تمہاری خالہ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

"جبھی تو کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ اجازت دیں تو ایک دن کے لیے لاہور چلی جاؤں اور خالہ سے بات کروں۔ ویسے بھی مجھے ان سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میری شادی پر آئے تھے وہ۔ اس کے بعد ملاقات ہی نہ ہوئی"

جب سعید نے سنا کہ بھابی اس کے ساتھ ایک دن کے لیے لاہور جا

رہی ہیں تو وہ خوشی سے ناچنے لگا "اوہ بھابی میری تو عید ہو جائے گی۔ ہم تینوں ایک ہی جگہ ہونگے۔ تم میں اور وہ!"

خالہ اور تبسم بڑے تپاک سے ملیں۔ مانی تو تبسم کے گلے کا ہار ہو گیا۔ کچھ ہی دن بھر آپا آپا کرتی پھری۔ اور تسلیم بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی رہی چونکہ سعید بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔

رات کو جب خالہ اور تبسم اکیلی بیٹھی تھیں تو تبسم نے سعید کی بات چھیڑ دی کہنے لگی "خالہ جی! تسلیم کے متعلق بھی سوچا ہے آپ نے۔ اللہ رکھے اب تو جوان ہو گئی ہے؟"

"میں نے کئی بار تمہارے خالو سے کہا ہے پر تم جانتی ہو بیٹی۔ ان کی اپنی ہی طبیعت ہے کہتے ہیں لڑکی سیانی ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ لڑکی سے پوچھے بغیر یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے تو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگتی تم ہی بتاؤ بیٹی بھلا ماں باپ لڑکی سے ایسی بات پوچھتے ہوئے اچھے لگتے ہیں کیا؟ توبہ! ہمارے زمانہ میں تو بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ ہم تو ہوتے ناپرلے کے بیٹی۔ لیکن وہ تو میری بات سنتے ہی نہیں"

"اس بارے میں ایک بات کہوں خالہ اگر تم برا نہ مانو تو؟"

خالہ کے ماتھے پر شکن پڑ گئی "اے لو میں کیوں برا ماننے لگی۔ تم سے بڑھ کر مجھے کون عزیز ہو گا بیٹی!"

تبسم جھینپ کر بولی "میرا مطلب ہے۔ سعید ماشاء اللہ جوان ہے۔ اس سال بی اے کرے گا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے وہ اگر ——— آپ کی کیا رائے ہے؟"

"لو بیٹی وہ تو اپنا ہی لڑکا ہوا۔ مجھے تو اس بات میں بڑی ہو گی۔ میں آج تمہارے خالو سے بات کروں گی۔ میرا خیال ہے انہیں اس بات میں کیوں اعتراض ہونے لگا۔ اپنی لڑکی اپنے گھر میں ہی رہے تو اچھا ہی ہوتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیوں ہے نا بیٹی؟"

اگلے دن خالہ ہنستے ہوئے کہنے لگیں "میں نے کہا نہ تھا کہ انھیں بالکل اعتراض نہ ہوگا کہنے لگے کہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ بشرطیکہ تسلیم ــــ بُرا نہ ماننا بیٹی۔ آجکل کا دولہا جو ہوا۔ اب مصیبت یہ ہے کہ تسلیم سے میں تو بات کر نہیں سکتی مجھ سے تو نہ ہو سکے گا۔"

"میں خود پوچھ لوں گی خالہ جی۔ آپ بے فکر رہیں" تبسم نے ہنستے ہوئے کہا۔

دوپہر کے وقت بہانے بہانے تبسم تسلیم کو بیٹھک میں لے گئی۔ لیکن وہ سمجھ رہی تھی کہ کیسے بات کرے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے چند ایک منٹ تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اس کی نگاہ سعید کے بستر پر جا پڑی۔ بستر لگا ہوا تھا اور تکیہ کے نیچے سے تصویر کا ایک کونہ دکھائی دے رہا تھا۔ مبادا سے وہ بات یاد آگئی "ایمان سے بھابی میں اس کی تصویر بڑی احتیاط سے رکھتا ہوں۔ روز سرہانے رکھ کر سوتا ہوں۔ اور صبح سویرے اٹھا کر دیکھتا ہوں" ــــ وہ مسکرا پڑی اور کہنے لگی "تسلیم میرا ایک کام کرو گی بڑی مشکل آن پڑی ہے تمہاری کوئی سہیلی ہے۔ جانے کیا نام ہے اس کا۔ سعید کو اس سے بڑی محبت ہے بھئی" اس نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا "ہمارا ارادہ ہے کہ اب سعید کی شادی کر دیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کے ماں باپ کے بات کرنے سے پہلے لڑکی کی مرضی پوچھ لیں اگر اسے منظور ہو تو پیغام بھیجیں کیوں تسلیم ہے نا ٹھیک؟"

تسلیم کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

تبسم مسکرا کر بولی "تم اگر باتوں ہی باتوں میں پوچھ لو تو میرے دل سے یہ فکر جاتا رہے"

"مجھے کیا معلوم کہ وہ کون ہے آپا!" تسلیم نے بصد مشکل کہا۔

"میں بتاتی ہوں تمہیں!" تبسم نے ہنستے ہوئے جواب دیا "دیکھو نا سعید کو اس لڑکی سے اتنا پیار ہے کہ روز اس کی تصویر سرہانے رکھ کر سوتا ہے۔ اور صبح سویرے سب سے پہلے اسے اٹھا کر دیکھتا ہے۔ یہ دیکھو اب بھی تکیہ کے نیچے پڑی ہے۔ آج شاید وہ اسے اٹھانا بھول گیا ہے۔ یہ دیکھو" تبسم نے تکیے کے نیچے سے تصویر نکال کر تسلیم کو دکھاتے ہوئے کہا۔

تبسم کی نگاہ تصویر پر پڑی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی اپنی ہی تصویر تھی۔ ماتھے کا بل چاقو سے کھڑنچا ہوا تھا۔

تسلیم کھلکھلا کر ہنس پڑی "مجھ سے مذاق کرتی ہو آپا ــــ مذاق" ہنستے ہنستے اس کی ہچکی سی نکل گئی۔ اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔ اور گال آنسوؤں سے تر تھے۔ عین اس وقت سعید داخل ہوا۔ جانے کب سے دروازہ میں آ کھڑا ہوا تھا۔ سعید کو دیکھ کر چلانے لگا "دیکھو بھائی جان باجی کو کیا ہو گیا ہے۔ منہ سے ہنستی ہے اور آنکھوں سے رو رہی ہے"

محمد یونس لائبریری
ملاک نمبر 15 - مکان نمبر 50
اسکیم ویلفیئر سوسائٹی - کراچی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

محمد حسن عسکری

حرام جادی

دروازہ کی دھڑ دھڑ اور کواڑ کھولو کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنویں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پُرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں۔ لیکن دوسرے لمحہ ہی منہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اُجالے میں ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہوگئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈلوں کو دبا دبا کر سلانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر جھنجھنا رہے تھے۔ وہ اس سحر خیز خلہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے — اور پھر بھی وہ جھنجھنا رہے تھے۔

امید و بیم کی یہ کشمکش جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی زیادہ دیر جاری نہ رہی ہوتی اگر دروازہ کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبرا، بیتاب، کرخت اور جھنجھلائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں "کھولو — کھولو" یہ آوازیں پتلی، لوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کئے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا کھولو۔ کھولو کے وقفہ کے درمیان آہستہ سے ناخوش گوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا..... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں اور ہاتھوں کو چارپائی پر ٹیکتے ہوئے کہا "نصیبن کھولو کون ہے؟"

یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب سے وہ اس قصبہ میں منڈوالف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا — یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش یہی جھلاہٹ اور پسپائی — سب اسی طرح، اسے صبح ہی اٹھ جانا پڑتا تھا۔ اور پھر اس کا سارا دن نو واردوں کو احتجاجانہ چیخیں چلاتے، ہانپتے، پھیکے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں کچھ دن آئے ہوؤں کی رفتار کے معائنہ میں اور آمد و رفت کے اندراج کے لیے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گذرتا تھا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی (کھینچ تان کے بعد) ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے۔ دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے — ہر گھنٹے ہر گھڑی اسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آرہے تھے جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر۔ ضبط تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکے تھے۔ اور اگر بفرض محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہونچ بھی جاتے تو یقینی بات تھی کہ قصبے والے انھیں ذرا بھی قابل اعتنا نہ سمجھتے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل۔ ہر سال کے ۵۶ سالہ بڈھے، الھڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تندہی اور یکجہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کیے جا رہے تھے۔ گویا وہ قومی دماغ کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں۔ اور پھر وہ بیچارے کرتے بھی کیا، وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرضکہ بچے بچے آم تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، ریشمی مرغ کی طرح سرخ بچے اور کبھی کبھی گورے بچے۔ دبلے پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچ یا بعض موٹے تازے بچے، مرمرے ہوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے چھچھوندر کی طرح گھگھے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایملی نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاد پاد ڈھیر کے مینڈک برسے تھے، وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی ـــــ اور اس وقت اسے ہنسی بھی آجاتی تھی ـــــ کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں ـــــ پاد پاد ڈھیر کے زرد زرد مینڈک!

اور اسے انہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرہ کو برستے ہوئے دیکھنے کے لیے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڈوں کی سڑکوں، تنگ تاریک، میلی ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور گائوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے گھنے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا۔ اور پھر نالیاں تو ٹھیک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوار کے بہے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کیے رہتی تھی۔ صفائی کے جمعدار نالیوں کی گندگی سمیٹ سمیٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جن سے ایملی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لیے ایملی کو ہلکے پھلکے فیروزی سینڈل کی بجائے اونچی ایڑی والا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک کے ابھرے ہوئے لاتعداد کنکر اس کے پیروں کو ٹھوکر دیتے تھے۔ راستہ میں گئی بوڑھا اور کبڈی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی۔ اور یہاں کی گرمی! اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں۔ اور اس کے

پہیوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی جب وہ اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، ڈوبتی میں جلتی تپتی سڑکوں پر سے گذرتی تو اسے دور آلھا گائیکی آواز ڈھول کی گھٹ گھٹ اور درخت کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور پُر اسرار معلوم ہوتے، اور وہ چار بجتے بجتے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی مگر پھر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا ہے جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کیے رکھتا ہے۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی ـــــ ایک چمک، ایک کشادگی، ایک ہنسی سی کچھ ہریالی اس کے سامنے تیرتی ..... اور وہ پھر اسی تپتی ہوئی کنکروں، نالیوں ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا لیکن ہاں جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی۔ اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سینما کے پردے کی طرح پوری روشنی اور صفائی کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے گذرنے لگتیں۔ اور اس تصویر کو جتنا دیر چاہتی ٹھیرا لیتی۔ لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان ان مناظر کو یاد کرتی جن سے اسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا تو اس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی، گھر کی دیواریں مع رات کی تاریکی اس پر جھک پڑتیں۔ دل بیٹھنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا، اور اس کا سر کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی غرق ہو جاتا۔ اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اسی شہر کے اسپتال میں پہنچ گئی ہے، مگر ان در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ اجنبی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضا منجمد اور ناقابل حرکت ہو گئے ہیں اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دل پر مسلط۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی، اور دراصل اس کے لیے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایسے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہی اثرات پیدا کرنے والا، ماناکہ شہر میں بھی ایسی بنی ٹھنی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں گرد و غبار، شریر لڑکے موجود تھے اور وہ ان کے وجود سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ تو ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے واہ اور مطمئن تانگے کے گدیوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی۔ اس کی دنیا تو ان علاقے سے دور ضلع کے صدر ہسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ، اور وہاں کی ہوا کا لطف تو ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ ہسپتال کے سامنے تاڑکول کی چوڑی سڑک، جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی پہلی ڈیوٹی کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لیے نکلتی تھی تو دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھر پھرانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لڑی تیرتی اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پُر لطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے تپکتے ہوئے ہسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گذر جاتے تھے۔ اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرہ میں دوپہر کی تھکی اداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پُر وقار انداز سے ساڑھی کا پلو سنبھالے گزرتی تھی تو ہسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے "میم صاحب" کو سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے مگر کوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے۔ بلکہ کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ رعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اس کی شخصیت ہسپتال کا ایک جزو لاینفک تھی، اس سفید، سرد اور سنگین عمارت اور کے غیر مرئی مگر اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ ہسپتال کے کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح

کی حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کے مریضوں کے معائنہ کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دور پرے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجیوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں مگر اسے دو بدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی۔ اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی۔ اور صفائی اور سلیقہ کی ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف، بچھونے، چادروں اور دوسری جنسوں کے ٹکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کونلوں کا گھڑا، سوت اور روئی کی گٹھڑیاں، سب الم غلم بھرے ہوتے تھے۔ اور ایک انگیٹھی پر گھنٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرہ میں گوبری ہونے لگتی تھی۔ جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی۔ اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ــــ اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں ــــ اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں۔ اور گھبراہٹ میں سارے سامان ایسا الٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی گنجائش نہ بچتی تھی۔ اندر کی کشمکش، کھڑکھڑاہٹ، "ہائے یا اللہ یا اللہ" اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پا کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ اور ان کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انھیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ "ارے چپ چپ ..... دیکھ بھیا آیا ہے ..... صبح کو دیکھو ..... ننھا سا بھیا" مگر بچہ کو ننھا سا بھیا دیکھ سکنے کی امید انھیں اس وقت تک کوئی تسکین نہ دے سکتی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرض بنا لیا تھا۔ گو ایملی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پینے کی عادت ڈال لی تھی۔ لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں، اس کی طرف توجہ کئے بغیر ہی وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں اور سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجلا جھنجلا کر پیر پٹخے اور انھیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گذرنے کے بعد اسے ہر بار اندراج کے لیے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ اور ان کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں ان کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے۔ اور وہ اس کی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے "کہو میم صاحب، لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے کالے بالوں کی قربت اسے ہراساں کر دیتی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی۔ اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرہ سے آملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے سمٹ جاتی اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی تھی جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر بھنایا ہوا ہو، جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کونے میں اچھال دیتی اور کپڑے اس طرح جھنجلا جھنجلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نعیمن کو انھیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ اٹنا سیدھا کھانا طاق کے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ سر تکیے پر رکھتے ہی دیواریں، پیڑ، ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتے۔ بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ سر تکیے میں

اور ان کی روں روں دہاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو کر کمرہ کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں پر لیپ چڑھے ہوئے بچوں، پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں اور مدتوں سے نہ دھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے جسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی۔ اس کا جی الٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک گھنٹے گذارنا گویا جہنم کے عذابوں کے لیے تیاری کرنا تھا یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ قصبہ کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لیے پیش کرنے اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے، جو ان دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھیں ہاتھوں میں دیدینے کے لیے قطعاً تیار نہ تھیں۔ انھیں تو قصبہ کی پرانی دائی اور پھٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انھیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کے کمرے میں موجود گی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بہت کم ہو گیا تھا لیکن آخر ذمہ داری تو اس کی ہی تھی۔ اور وہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے سربراہی بھلائی کے لیے جواب دہ تھی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر نوگرفتار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتیں اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انھیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ یا پھر ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی رُک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں۔ اور ایملی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا اور دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی۔ اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایملی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گھٹا جاتا مگر کیا اسے اوپر اچھالتا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے۔ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی ـــــ کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موڑ کے پیچھے نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی سخت مونچھیں، یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکنے میں غائب ہو جاتے وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخی کا اضافہ کر سکتی بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا ایک پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا، نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہوتا ..... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیہ والی نالی بہنے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بیتابی سے ہلتیں ..... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی، جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی دوڑتی .... سیاہ آسمان پر روشن ان گنت تاروں کے گچھے کے گچھے بھنگوں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کرنا چنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور بھد بھد سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں ..... سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا۔ اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آ دھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی ..... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے ..... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی

رزم گاہ سے رخصت ہوتیں، ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی اور ایلی نیند میں بالکل بیہوش ہو جاتی مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے کواڑ کھولو، کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں ـــــ وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی جھلاہٹ اور لپاپائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے ہاں بلایا گیا تھا۔ اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا "جلدی ـــ بلایا ہے ـــ جلدی ـــ" ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے جلدی ـــ آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ ان کی نوکر ہے یا وہ اسے دولت بخش دیتے ہیں۔ ہنہہ ـــ جلدی! وہ نہ پہونچے گی تو کیا سب مر جائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلا کر؟ ـــ کہتی ہیں چڑیلیں، اسے کیا خاک آتا ہے ـــ "کیا خاک آتا ہے ـــ کچھ نہیں آتا ـــ اچھا پھر؟ بیٹھیں اپنے گھر، کون ان کی خوشامد کرنے جاتا ہے ـــ کچھ نہیں آتا! جیسے جیسے آئے اس نے دیکھے ہیں ان لوگوں کے تو خواب میں بھی نہ گذرے ہوں گے ـــ چمکیلے تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے ـــ اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر، وہ نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں ـــ کچھ نہیں آتا ـــ ہونہہ!

ایلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلوا دے وہ جلدی نہیں آ سکتی۔ وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں ان کے کہنے سے اس کا بگڑنا کیا ہے اور آخر نوکری ہی تو ہے اور نوکری ہی ہے۔ چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا "کہہ دو کہ چلو، میں آ رہی ہوں" مطمئن ہو کر اس نے کروٹ لے لی۔ سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے اور ساکت ہو جائے مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ سکوتوں میں بج رہی تھی۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبھی کبھی ایک پتھر سا دماغ میں آ کر لگتا تھا "جلدی ـــ" جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اسے جلدی جانا تھا ـــــ جلدی... اور اسی بات کے تو دو ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی۔ جلدی جانا تھا..... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کر سکتی تھی۔ کل رات ہی تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین ـــــ اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کمر بیٹھی جا رہی ہے۔ کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اٹھ جانا بہت مضر ہوگا، اور خصوصاً اس قصبہ جیسی آب و ہوا میں جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر مہینے میں اسے چار دن بخار آیا تھا ـــــ اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی، ان لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اس کی۔ تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا!

وہ سو جاتی، مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے ہاتھ آنکھوں پر رکھ کا لیا، اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ مگر ہر دفعہ "دودھ لو، دودھ لے" اور "اٹھو اٹھو! ابے پڑے جانے کا؟" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لیے۔ اب اس کے اعضا اور بھی بوجھل اور ناقابل حرکت ہو گئے۔ اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان نکما نہ طلبیوں سے "جلدی بلایا ہے" اس صبح کے چاند نے اس قصبہ پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اس کو ان صداؤں آوازوں، ان نکما نہ طلبیوں "جلدی بلایا ہے" اس صبح کے چاند نے، اس قصبے، سب سے چھپا لے جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہونچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے ـــــ اپنے آپ سے غافل

ہو جائے ـــــ اپنے کو کھو دے..... اسے محسوس ہوا کہ دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں..... سر کے درد کو گویا یکایک کسی نے پکڑ لیا..... دو آنکھیں بھی ذرا کچھ دور چمکیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا..... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا، سکون تھا، خاموشی تھی اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی..... دو بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے۔ دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو.....

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں صبح کے چاندنے میں چمک آ گئی تھی۔ نصیبن نے چولھے پر دیگچی رکھی۔ بکری والا محلہ سے جانے کے لیے بکریاں ہانک رہا تھا اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں..... دو بادامی سائے اترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں ـــــ گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں..... سائے کچھ دور پر رک گئے، وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے..... آنکھیں صبح بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے..... دو مدت کے آشنا بازو..... مگر وہ یہاں کہاں!

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ نصیبن کو پکارنے لگی۔ لمبے لمبے الجھے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ ڈوروں والی جلد جلد پھرتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا بھلا ہونٹ کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو... ان میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازو اسے بھینچے تھے اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو جھنجلا پڑتی تھی۔ مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا..... اور اس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تم آلو دبو سے ..... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی۔ مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے، ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا۔ اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا؟..... میری جان ..... ہا ہا ہا ہا... اے ہی ہی ..... ڈی یر..... پیاری پیاری ..... ہا ہا ہا ہا ۔ اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا۔ اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی، میری جان؟..... ہیں؟..... اس سینے پر تو سرخ کھلے گی! کہو کیسی رہی؟ ہا ہا ہا ہا ۔ اور وہ اسے دوپہر میں تو کبھی نہ کھلنے دیتا تھا اگر اسے ایسے وقت اپنا سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمن سو رہی ہیں اور وہ اس کے اٹھنے سے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لاکھتا تھا۔ اور وہ اسے کتنے پیار سے پیتی تھا۔ مگر وہ یہاں کہاں ..... اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کو اٹھ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ..... لیکن وہ یہاں ہوتا ..... وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی

لیکن ..... کچھ دوسری شکلیں ابھریں ..... اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے ..... اس کا بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا۔ اور اس نے اسے کبھی بیرحمی سے بید سے پیٹا تھا تو لے، اور لے گی ..... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ ..... اگر میم صاحب شور سن کر نہ آجاتیں تو نہ معلوم وہ اسے اور کتنا مارتا ..... ایملی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی ..... ایسے مار سے تو چمکارنا ہی اچھا ..... کیسی خونی آنکھیں، اور آخر میں وہ شراب کتنی پیے تھا ..... مگر وہ ہوتا تو اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا ..... مانا کہ وہ روز اس کے ساتھ رات کو بڑی دیر تک ٹہلتا رہتا تھا۔ لیکن ظاہرا تو اس کے ساتھ

اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا ..... اگر وہ خود اتنا بگڑ نہ جاتی اور اسے اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو وہ شاید بات یہاں تک نہ پہونچتی ..... وہ اسے کتنے پیار سے بھیجتا تھا ..... لیکن وہ کیسے منہ پر بڑیاں نکلی ہوئی۔ سوکھی جیسے لکڑی ہو ..... اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آگئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی اسے شیخی کے ..... نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی اس میں جو وہ ایسا الٹو ہو گیا تھا ..... اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا ..... وہ اسے تھوڑے دن یونہی چلنے دیتی تو کیا تھا ..... مگر اس نے کسی بیرحمی سے اسے مارا تھا ..... ہاں ..... ایک دفعہ مار ہی لیا تو کیا ہو گیا۔ وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا ..... اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی۔ بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اسے اکساتی رہی ..... یہ اچھی دوستی ہے ..... اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی۔ اور اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی۔ اور جو ڈینا اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی ..... ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے۔ اب وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے .....

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی، اگر نصیبن اسے نہ پکارتی "بی بی میم صاحب اٹھو، سورج نکل آیا" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور چاروں طرف دیکھا اب تو واقعی اسے چلنا چاہیے تھا۔ مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیہ پر سر رگڑا۔

وہ منہ دھو کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی۔ نصیبن لکڑیوں کو چولھے میں ٹھیک کرتی ہوئی بولی "وہ مٹنیاں کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتی ..... اجی ہو ہی آؤ ان کی طرف میم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب کسی دن، بڑا یاد کریں ہیں تمہیں۔"

ہو ہی آئے ان کی طرف — کیا کرے وہ جا کر میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے ٹٹاٹے — یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انھیں تو قصے سنائے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کو اتنی تکلیف ہوئی، اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصے سنانے کو۔ اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انھیں .... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پہ چڑھ جاتی ہیں ..... اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے ... جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں۔ گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی — یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے — عجیب بیوقوف ہیں یہ عورتیں — اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں۔ اور اگر کہیں اس کی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ جاتی ہیں۔ اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے اور اگر انہیں اسکے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں جیسے اس کی نظر ان میں سے کچھ چھٹا لے گی یا اس کی نگہ پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی — ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انھیں اس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں — ؟ اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا۔ بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں — اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھ ننگے، پیٹ نکلا ہوا، وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں، جیسے وہ نیا پکڑا ہوا عجیب و غریب جانور ہے — اور جب وہ ان سے بولتی ہے، تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں — وحشی ہیں بالکل، جانور ..... بالکل — اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی ان کے ہاں بھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انھیں۔ اور کوئی کیوں ان کے ہاں جا کر بیماری مول لے۔ اور ان کے مرد، کتنی شرم آتی ہے اسے ان حرکتوں سے۔ وہ ہوٹہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہلتے — "ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ" اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں وہ گھبرا جاتی ہے — جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں — تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں — اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجیب بدتمیز ہیں — انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی۔ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے، بہت اچھے آدمی تھے بیچارے، ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے — سب مل جایا کرتے تھے۔ اتوار کو گرجا وہ خود۔ ڈیتا۔ کلی۔ میری۔ سشیلا۔ اور ہاں مرسی — مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں چھڑی ہاتھ میں لیے ہانپتی ہوئی اور ان میں تھا ہی کیا، ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس — اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے، آپس میں، ہنستے، مذاق کرتے — اوہ شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی۔ کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی — مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں — اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں — اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے۔ اور پھر البتہ سے کوئی کیا ملے؟ — جیسے جانور — نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہنسنے بولنے کو بس آدا اور پڑ رہو ـــــ لے دے کے رہ گئی نصیبن، تو اسے اس کے سوائے کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا، اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی۔ اس کے یہاں برات بڑے دھوم دھام سے آئی ـــــ اسے کیا ان سب باتوں سے ہوا کرے، اس سے مطلب ـــــ یا بہت ہوا تو اُسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چڑیوں کے قصے سنا سنا کر ـــــ ایک دفعہ اس نے سنا یا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ـــــ بکتی ہے بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے۔ لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ ـــــ مگر نہیں، بیکار کا ڈر ہے جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں ـــــ بھلا دنیا کا کام کیسے چلے۔ پاگل ہے بڑھیا، بہکا دیا ہے کسی نے اسے ـــــ مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار، نہ معلوم کیا ہو گیا ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں ـــــ اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا۔ اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی۔ بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ـــــ کتنے دن ہو گئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ـــــ بارہ سال، کتنا زمانہ گذر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل بات ہو ـــــ کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے ـــــ روز اسکول پہونچانے جاتے تھے ساتھ ـــــ کلاس میں اس کی سیٹ میز کے پاس تھی ـــــ وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے آدمی تھے ـــــ بچا لے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے، مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ـــــ اور لڑکے تو نہ جانے اسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا۔ سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ـــــ اے وہ موٹا کرم چند، بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا۔ جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اسے ـــــ اور ہاں وہ عظیم! بڑا بھولا تھا بیچارا، سوکھا سا زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو

وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا ـــــ اور اس دن دل دل میں کتنا ہنسی تھی، اس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدہ میں دوسری طرف سے وہ آ رہا تھا، جب وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا، اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اس نے بڑبڑا کر کچھ کہا تھا، کیا کہا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا ـــــ وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ـــــ کتنا سیدھا واقعی وہ ـــــ وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا ـــــ مگر ـــــ وہ زمانہ تو اب گیا۔ اب تو وہ یہاں دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں ـــــ کسی کا خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روزانہ ڈاکیے سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں مگر ـــــ روز جواب وہی "نہیں" ـــــ اور جو آیا بھی تو بس وہی لیے بادامی لفافے ـــــ آن ہز میجیسٹیز سروس ـــــ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو، اور دوں کرو۔ کوئی اس کی مانے بھی جو وہ یوں کرے خواہ مخواہ کی آفت ـــــ اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟ ـــــ اگر آنٹی ہی دلی سے خط بھیجا کریں تو کیا ہے ـــــ مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں ـــــ ایک دفعہ جانا چاہیے اسے دلی ـــــ اچھا شہر ہے ـــــ کیا چوڑی سڑکیں ہیں ـــــ اور سینما کس کثرت سے ہیں ـــــ اور وہ ـــــ وہ خیر ہے ہی ـــــ مگر وہ ـــــ

کوئیں کائیں، کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا، اور وہ بستر پر پیچ و تاب کھا کے لیٹی تھی، اسے جلدی جانا تھا اور اس نے بیکار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اس نے چائے کیوں نہیں لا کر رکھی۔ مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں۔ اور واقعی، اس نے خیال کیا، اس سے تو وہ اتنی دیر سو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہرحال اس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اس نے دوبارہ منہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کونسی ساڑھی پہنے ـــــ سفید، سرخ کناروں والی۔ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ ـــــ اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے۔ اس کی بہار تو بس ایک دن ہے۔ اگلے دن کام کی نہیں رہتی ـــــ نیلی ساڑھی نیچے سے چمک رہی تھی ـــــ اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ ـــــ مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باڑے ہو جائیں گے ـــــ وہ جدھر سے نکلتی ہے سب کے سب اسے گھورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بُری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت ـــــ اور ان زمینداروں کو دیکھو، بڑے شریف بنتے ہیں؟ ـــــ خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں ـــــ اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں ـــــ "کہو یار! ہے بے مجید ذرا لیجو اسے ـــــ کوئی کھانسنے لگتا ہے کیا وہ سمجھتی نہیں ـــــ ذرا شہر میں رہ کے دیکھے ایسی باتیں ـــــ وہ مزا چکھا دیتی انہیں ـــــ مگر یہاں وہ کرے، مجبور ہو جاتی ہے ـــــ ان کی ہی وجہ سے تو اس نے رنگدار ساڑھیاں چھوڑ دیں اور سفید پہننے لگی، مگر پھر بھی نہیں مانتے ـــــ اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے ـــــ تو پھر سفید ہی پہن لے ـــــ مگر روز روز سفید اور کیا، وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اسے کھا تھوڑی ہی لیں گے بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اس کا؟ ـــــ اب وہ پھر رنگ دار ساڑھیاں پہنا کرے گی ـــــ دیکھیں وہ اس کا کیا بنا لیتے ہیں ـــــ ہنسیں گے تو ضرور ـــــ مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے ـــــ آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی!

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لیے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر

آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی ـــــ مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کمال بھی کھردری ہو چلی تھی ـــــ جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کتنی [illegible] تھی ـــــ رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا ـــــ اس کی آنٹی ہمیشہ اماں سے کہا کرتی تھیں، تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے ـــــ مگر اب ـــــ

اس آئینہ رکھ دیا اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مور اپنے پیروں کو ـــــ اس بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سوکھے اور [illegible] رہ گئے ہیں۔ اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی [illegible] تھی اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے [illegible] ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق [illegible] اور پپوٹے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس نے بال [illegible] دلی سے بنائے کہ بہت سے تو ادھر ادھر اڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے [illegible] مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی۔ اور اس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے [illegible] میں آ گیا تھا۔ جن میں ایک ہی جگہ ٹھیرے ٹھیرے مرچیں سی لگنے [illegible]

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل [illegible] نظر آئی یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اس کے پاپا نے اسے دی تھی۔ [illegible] یہ اس نے اسے کھولا تک نہ تھا۔ اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب [illegible] سے پھر پاپا کی یاد دلا دی اور وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ پہلے ہی صفحہ پر [illegible] کا نام لکھا تھا۔ لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس [illegible] پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی ہنسی آئی کہ وہ اس وقت کیسے [illegible] میڑھے حروف بنایا کرتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانہ میں اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے پاس ہر اقلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی، تو ایک ہر اقلم ضرور خریدے گی۔ مگر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا۔ اسے کونسا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائیبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائیبل کے ورق الٹنے لگی۔ پیدائش — خروج — ورق تیزی سے الٹے جانے لگے — استثنا — روت — یرمیاہ — جفوق — متی — لوقا — رسولوں کے اعمال۔ کہاں سے پڑھے — آدم — نوح — طوفان — ابراہیم — کشتی صلیب — مسیح — یسوع جا آئے — گرجا کا گھنٹہ — سب مل کر گڈمڈ ہو جاتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے —

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کونسی جگہ سے پڑھے۔ اور اسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائیبل پڑھا کرے گی ورنہ کم سے کم اتوار کو ضرور — لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے — بہت ہی بری بات ہے ماما کبھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں — اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا۔ اور لگے بھی تو کیا ہے دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر باوجود اس کے آنکھیں پھٹ پھٹانے کے پہلے تو اس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھس آئیں اور پھر پاپا اور ان کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ، اور سب مل کر گڈمڈ جا کرتے تھے۔ ہنستے، مذاق کرتے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکا دیا گویا وہ ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے — آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا، اور خاموش۔ صرف کانوں اور سر میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور دعا کو دہرانے

چلی گئی" اے میرے باپ تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین!"

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی، اس نے پھر آئینہ میں جھانکا اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لیے دعا مانگے۔ لیکن کیا چیز؟ کوئی! — اس کا تبادلہ شہر کو ہو جائے — مگر وہاں اسے پھر ولھیلن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے — پھر اور کیا؟ — وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا — پھر آخر کیا؟ —

اس نے بہت یاد کرنا چاہا۔ مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اس لیے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ اور وہ سڑک کی نالی، ریت کنکروں سب سے بے پروا اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے اپنی رفتار میں کبھی کچھ سستی معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک نہ نکلے تھے اس لیے اسے اپنی آنکھ ناک کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سایہ میں سے گزرتی تو اس کے پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک دکان دار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مسکرا رہا تھا۔ کیا یہ اسے دیکھ کر تھا؟ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اسے دیر بھی ہو گئی تھی ــــ وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی..... بڑے دن میں ایسا ہوا ہے آج" ــــ اس نے چاہا پلٹ کر چیخی رسید کرے اس بدتمیز کے..... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہدے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی ــــ آخر کہاں تک؟ ــــ پیر من من بھر کے ہو گئے تھے، اور ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی ــــ مگر ان آنکھوں نے جو اب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اسے رکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلّہ اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی.....

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے حکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی بولے:-

"اخاہ میم صاحب! بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو!"

"جی..... ہاں..... وہ ذرا دیر ہو گئی" کہتی ہوئی وہ زنانہ کی طرف بڑھی۔

جب وہ دروازہ پر پہونچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گزر رہی ہے، یہ کہتی ہوئی "جرا دیکھو تو..... ابھی تک نہ نکلی گھروے سے حرام جادی"

ختم شد

کتبہ ذوالفقار احمد

اس کتاب کے

افسانہ نگاروں کے مختصر حالات زندگی

—

اوپندر ناتھ اشک

نثر کی بجائے شروع شروع میں مجھے نظم کا زیادہ شوق تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچپن میں دادا سے سنی ہوئی کہانیوں کی بنا پر میں نے نثر میں قلم بند کرنے کی کوشش کی اور پھر آرسین لوپن اور جاسوس بلیک کے قصے پڑھ کر ایک جاسوسی ناول بھی لکھا لیکن میرا زیادہ وقت پشتا نجلی کی طرز پر بھجن بنانے یا ملکھی رام اور لی سی۔ گجرانی کی طرز پر پنجابی کے بیت بنانے میں گذرتا تھا۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بیمار رہتا تھا اور بیکار وقت اسی طرح گذارتا تھا۔

جہاں تک پبلک زندگی کا تعلق ہے، میں نے ادبی زندگی ایک پنجابی کے شاعر کی حیثیت سے شروع کی۔ جہابیر دل کی طرف سے ہولی پر ایک کوی سمیلن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں نے بھی ایک لمبی نظم لکھی۔ اور اس پر مجھے ایک چاندی کا تمغہ انعام ملا۔

اس کے بعد میں نے اور دو تین مشاعروں میں پنجابی نظمیں پڑھیں۔ لیکن میں جلد ہی اردو میں شعر کہنے لگا پنجابی کو چھوڑ کر ایک دم اردو کی طرف رجوع کرنے کی وجہ اس کے سوا کوئی نظر نہیں آتی کہ جالندھر کی پنجابی شاعری اس وقت اَن پڑھ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رنگریزوں، موٹر ڈرائیوروں، کوئلہ فروشوں اور نیچے بندوں تک محدود تھی۔ اور ایک دو شاعروں کے بعد شاید میری بورژوا ذہنیت کو ان کے ساتھ مل کر پڑھنا پسند نہ تھا۔

کالج تک جاتے جاتے اردو شاعری کا شوق خبط حد تک پہنچ گیا تھا اور تبھی کسی استاد سے مشورہ لینے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ چنانچہ حضرت آذر جالندھری کی شاگردی اختیار کی۔ لکھنے کا اتنا شوق تھا کہ دن میں دو دو تین تین غزلیں ہو جاتیں لیکن میرا یہی شوق شاید مجھے نظم کو چھوڑ کر نثر کی طرف شدت کے ساتھ مائل کرنے کا سبب ہوا۔

بات یہ تھی کہ میں تو دن میں دو دو غزلیں لکھ لیتا۔ اور آذر صاحب دو مہینے میں بمشکل تمام ایک غزل دیکھ کر دیتے۔ ان کی یہ عادت رہی ہے کہ اپنے شاگردوں کو دیوان کے دیوان انھوں نے اٹھا دیئے ہیں۔ آذر صاحب کا بہترین کلام یا تو ان کے شاگردوں کے نام چھپا ہے یا ان کے پاس محفوظ ہے کسی دوسرے کی لکھی ہوئی چیز کو اپنے نام سے پیش کرنا مجھے کبھی منظور نہیں ہوا۔ اس لیے جہاں ان کے دوسرے شاگرد ان کی لکھی ہوئی غزلوں کو اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے، میں اپنی غزلوں کے ٹھیک ہونے کی بات جوہا کرتا تھا۔ کالج سے آکر بغیر کھائے پیے میں اس راستہ میں جا کھڑا ہوتا تھا جہاں سے وہ بستی غزاں کو جاتے ہوئے گذرتے پھر ان کے ساتھ ہو لیتا اور بار بار بستی تک جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ میں جتنی بھی غزلیں لکھوں وہ انھیں ۔ وز کے روز ٹھیک کر دیں۔ لیکن وہ کبھی کوئی ٹھیک کر کے لا دیتے، کبھی بھول جاتے اور کبھی غزل ان سے کھو بھی جاتی۔ ان دنوں لکھنے کا اتنا شوق تھا کہ میں اس سست رفتاری سے تنگ آگیا۔ اور اچانک میں نے کہانیاں لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا انھیں تو کسی کو دکھانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں میری پہلی کہانی روزانہ "پرتاب" لاہور کے سنڈے اڈیشن میں نکلی، اس کے بعد متواتر کہانیاں لکھتا رہا۔ اور کوشش کرتا رہا کہ دوسری کہانی پہلی سے اچھی لکھوں۔

چونکہ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، مشورہ نہیں لیا، خود ہی کہانیوں کو بگاڑتا سنوارتا رہا۔ اس لیے مجھے ایک کہانی کو کئی بار لکھنے کی عادت پڑ گئی جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی میں برابر لکھتا رہتا ہوں۔ مجھے کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن کامیابی سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ میری بھوک اَن مٹ ہے، افسانوں کی بجائے میں کچھ اچھے ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ناول لکھنے کا شوق ہے بلکہ اس لیے کہ جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں کہانی اور ڈرامے کا کینوس اس کے لیے چھوٹا ہے بہرحال اگر ڈراموں نے مجھے اور کہیں کا رکھا تو چند اچھے ناول ضرور لکھوں گا۔

ناز لائبریری
فضل مارکیٹ نزد کے ایم سی مارکیٹ
B کمرشیل ایریا ناظم آباد نمبر 2 کراچی

اختر اورینوی

منتخب افسانہ کو پسند کرنے کی وجہ:-

اولاد معنوی میں فرق کرنا دل کے بس کی بات نہیں لیکن پاسبانِ عقل سے یہ کام سرانجام پا سکتا ہے۔ پھر بھی دل پر گذر جاتی ہے۔

فن عمر تجربہ کے ساتھ پختہ ہو جاتا ہے۔ عروج کے بعد زوال کے بھی آثار دکھائی دیتے ہیں۔ پر ابھی میں پختگی کی اس منزل تک پہنچا کہا ہوں۔ میرے ابتدائی افسانے اپنے دور کے نمائندے ہیں۔ میں نے ابتدا میں بھی جذبی اور ذہنی زندگی کے دونوں پہلوؤں کو منعکس کرنے کی سعی کی ہے ترقی پسندی کا شعور ۱۹۳۴ء میں اس آہنگ کے ساتھ کم از کم شروع نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اگنی سینا ٹوریم کے بستر پر لیٹے لیٹے دو افسانے لکھے تھے "سینا ٹوریم کا فقیر" اور "کام" اول الذکر ادبی دنیا لاہور میں شایع ہوا تھا اور منصور احمد مرحوم نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ ثانی الذکر "ندیم" گیا کے بہار نمبر میں۔ یہ دونوں افسانے "منظر و پس منظر" میں شامل ہیں۔ میرے دوست علی اطہر دبی، اے علیگ مصنف، نے ۱۹۳۶ء میں مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے آگاہ کیا۔ ملک راج آنند انہی دنوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پٹنہ آئے تھے شاید۔ افسانہ میں سے رجحانات سے پہلے نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری
ل احمد اکبر آبادی کا طوطی بولتا تھا۔ میں اپنے عنفوان شباب ہی سے ان جادو
سے متاثر تھا میرے چچا مولوی سید ارادت حسین مرحوم ادب نواز بزرگ تھے گھر
پر مجلسیں جمتی تھیں۔ نگار، نیرنگ خیال، نگارستان، گیتا نجلی پڑھی جاتی تھی۔ اور اہل
حلقہ لطف لیتے۔ میں فسٹ ایئر سائنس کا طالب علم تھا چھٹیوں میں گھر پر یہ فضا
شوق پر تازیانہ کا کام کرتی تھی۔ نیاز و مجنوں و ٹیگور میرے دیوتا تھے۔ میں نے
چپ چاپ ایک افسانہ لکھا اور نگار میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ دل دھڑکتا رہا اور
بلند میناروں پر چڑھ چڑھ کر طبع نیچے گرتی رہی۔ نیاز کا جواب آیا "آپ میں افسانہ
لکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ مگر ابھی خوب خوب افسانوں کا مطالعہ کیجئے"
امید و نا امیدی کی کشمکش نے تمنا کو زندہ رکھا ۱۹۲۶ء کی بات ہے ۱۹۲۷ء کے
اگست میں میرا ایک افسانہ "نیا شوالہ" نگار میں چھپا۔ اور مجھ میں خود اعتمادی پیدا
ہوئی۔ اس سے پہلے بہار ستان پٹنہ میں میرے افسانے "نیازی رنگ
کے چھپے تھے "بدگمانی" "زود پشیمانی" وغیرہ۔ یہ تینوں میرے دوسرے مجموعہ "کلیاں
اور کانٹے" میں شامل ہیں "بدگمانی" پہلا شائع شدہ افسانہ ہے۔ اور کلیاں اور
کانٹے" اس مجموعہ کا آخری افسانہ۔ آخر الذکر کی اشاعت نے بفضلہ ملک کے بلند
پایہ افسانہ نگاروں اور نقادوں سے خراج تحسین وصول کیا پروفیسر کنہیالال کپور نے
خود مجھ سے لاہور میں کہا "یہ اردو افسانوں کا حرف آخر ہے۔ اب آپ ناول لکھیں"
میری ذاتی رائے یہ ہے کہ "انارکلی اور بھول بھلیاں" بھی کلید محراب کی ایک اینٹ
ہے۔ یہ میرا اب تک سب سے آخری افسانہ ہے اور مجھے بہت عزیز۔ اس
میں آپ کا میرا اور ہندوستان کے سب ادیبوں کا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے

حالات: میرے کئی شائع شدہ افسانے ایسے ہیں جن میں خود میں بھی چھپا بیٹھا ہوں
اور میرے دوستوں کے نزدیک میں نے ان افسانوں میں خود اپنی
رسوائی کی ہے۔ مجھے جاننا ہو تو ان افسانوں کو پڑھیے "منظر و پس منظر" میں ابھی

منظر و پس منظر ہے "اور کلیاں اور کانٹے" میں میری رہ گذار کے پھول کانٹے
بھی ہیں۔

میں نے بچپن میں اپنی اماں جان اور دادی اماں سے اشعار اور کہانیاں ذوق
و شوق سے سنی ہیں۔ والدہ مرحوم مجھے اشعار سناتی تھیں اور نہایت درد انگیز کہانیاں
سناتی تھیں جیسے "سیت بسنت" دو یتیم بھائیوں کی کہانی" والدہ نہایت ہی رقیق القلب
خاتون تھیں اور نہ جانے کس طرح انھیں اپنی جوانمرگی کا یقین سا تھا۔ مئی
۱۹۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا جب میں ساڑھے چودہ سال کا تھا۔ والد صاحب
نے مجھے تھوڑی عربی پڑھائی، قرآن پڑھایا اور نذیر احمد صاحب کے ناول بھی۔
دادی اماں قصص القرآن روزانہ شام کو سنایا کرتی تھیں۔ میرے ایک
دور کے رشتے کے بھائی تھے عبدالمبین قیس۔ خوش باش، آزاد، ابن رئیس۔
عبدالحلیم شرر کے عاشق۔ ان کی کتابیں اچٹ اچٹ کر اسکول کے زمانہ میں ہی
خوب پڑھیں ان ہی سے الف لیلہ اور طلسم ہوشربا ملیں اور چچا مرحوم کی تحریک
پر پڑھی گئیں۔ کالج میں اقبال اور نیاز کا بڑے ولولے سے مطالعہ کیا۔ میں اور میرے
ایک دوست عبدالستار عرف Good G 6666 اور ابوالخیر مرحوم نگارستان
کی "کیو پڈ اور سائیکی" اس طرح رات کو پڑھتے تھے جیسے کوئی چپ کر لغت خانہ
سے انڈے یا گاجر کا حلوہ چرا کر کھائے اور پکڑے جانے کا خوف نہ ہو۔

میں ۱۹۱۰ء اگست میں پیدا ہوا ۱۹۳۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں اسکالر
شپ کے ساتھ میٹرک پاس کیا ۱۹۲۸ء میں وظیفہ کے ساتھ سکنڈ ڈویژن میں
آئی۔ ایس سی کیا۔ ۱۹۳۰ء میں میڈیکل کالج پٹنہ کے تھرڈ ایئر میں تھا کہ بیمار ہوا۔
سل کا شبہ تھا پڑھنا بند۔ دو سال تک پہاڑوں کو روندتا رہا۔ اور گھر پر کھیتی باڑی
میں مشغول رہا صبح سے شام تک کھیت میں رہتا۔ کھانا کھاتا تو کھیت کے اوپر۔
مکمل دہقان ۔ دو فصلیں کٹوائیں بوائیں اور کھلیان سے بکوائیں نسلاً گاؤں
والا ہوں۔ چھ سات سو سال سے آباد اجداد "اورینہ" یا اورینی میں دھرتی

ملاک نمبر 80 - نگار نمبر 15 - پروفیسر سیماب اکبر آبادی - کراچی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا سینہ چیرتے رہے ہیں۔ جو سندھ سے دلی آئے اور وہاں سے سیّد احمد جائسی بہار فیروز تغلق کے عہد میں آئے۔ سیّد احمد جان کی اولاد اورنگی میں آباد ہے۔

میٹرکیولیشن ختم ۱۹۳۲ء میں بی۔ اے میں نام لکھایا۔ ۱۹۳۴ء میں انگریزی آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا۔ کالج میں فرسٹ اور یونیورسٹی میں تھرڈ آیا۔ مگر اب واقعی سِل ہوگئی۔ اگست ۱۹۳۴ء میں اٹکی سینا ٹوریم بھیجا گیا۔ ڈیڑھ سال وہاں رہا اور خوب پڑھتا رہا۔ ۱۹۳۶ء میں اردو ایم۔ اے پرائیویٹ طور پر دیا۔ فرسٹ کلاس اور تمغہ طلائی ملا۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں لکچرار اردو مقرر ہوا۔ اور اب تک زندہ ہوں۔

میرے دماغ و دل اور میری شخصیت کی تعمیر میں چند چیزوں نے بہت حصّہ لیا ہے۔ احمدیت (سلسلہ احمدیہ اسلامیہ)، اقبال کی شاعری، نیاز کی فسانہ نگاری۔ سائنس کا مطالعہ، گھر کی فضا، اشتراکیت کا تفصیلی مطالعہ اور میری سسٹل عدالت۔

چودھری محمد علی

محمد علی، قوم شیخ صدیقی، ساکن ردولی، پیشہ آبائی تعلقہ داری، نام تعلقہ امیرپور، ضلع بارہ بنکی، صوبہ اودھ، تاریخ پیدائش ۱۸ مئی ۱۹۰۲ء، اس وقت تک بقیدِ حیات ہے۔ پہلے مکتب میں تعلیم پائی، پھر کانون تعلقہ دار اسکول (اب کالج) میں پڑھتا رہا۔ مگر کوئی امتحان نہیں پاس کیا۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری اور آج تک جاری ہے۔ انگریزی فارسی کا شوق تھا اور ہے۔ عربی سے نابلد مگر بیش بہا حکیم و بیش حکیم ملا غیر عربی دانوں کی صحبت میں اکثر عربی جملے اور آیات قرآنی بول جاتا ہے۔ انگریزی میں کوئی مکمل کتاب نہیں ہے۔ اردو میں تصانیف حسب ذیل ہیں "اتالیق بی بی" مطبوعہ دلگداز پریس۔ پہلی طبع عمدہ ہوئی تھی۔ بعد کو وہاں

جس پر لکھنے والے کو ناز تھا نکال دیا گیا۔ اور آج اسی طرح سے ہے جیسے بڑے گھر کی لونڈی۔

"صلاح کار" جنیات" پر خود مصنف سے مل سکتی ہے۔ اور جامعہ ملیہ سے بھی مل جائے۔ "نقادی کے بخیے" ایک رسالہ قلمی تصویروں کی پرکھ پر۔

"یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ" یہ رسالہ مصنف تقسیم ہوا۔ اب نہیں ملتا۔ "گناہ کا خوف" نیا سنسار لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

"پردے کی بات" ایک رسالہ ضبط تولید پر جو مفت مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اودھ پنچ مرحوم، معلومات مرحوم اور دوسرے رسالوں میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا۔ بعض مضامین باقی ہیں بعض کہانیاں، چھوٹے چھوٹے ڈرامے ضائع ہوگئے۔ ایک کتاب کا مواد اس وقت بھی موجود ہے۔ مگر کاغذ کا قحط اور شائع کرنے والے کی کمی مجبور کئے ہے۔

چھ برس صوبہ کی کاؤنسل میں رہا اور اردو میں تقریریں کیں۔

میں بقول ایڈیٹر صاحب "ادبی دُنیا" بڈھا ہوں اور واقعہ بھی یہی ہے مشبلی نعمانی مرحوم جب سلسلائی دُنیا کے سفر سے واپس آئے تب میں نے ہوش سنبھالا۔ اور جس طرح ان کے یہاں فارسی ترکیبیں مرزا عبدالقادر بیدل، غالب وغیرہ کی پیروی میں ہوتی تھیں شروع کیں اور ٹھوکریں کھاتا رہا۔ پھر خیال گزرا کہ بولنے کی زبان اگر اور ہوئی اور لکھنے کی زبان اور تو کام کیسے چلے گا۔ زبان ترقی کیسے کرے گی۔ ناچار یہ کوشش کی کہ جو بولا جائے وہی لکھا جائے۔ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ مرنے کے پہلے کوئی دوسرا برن بدلوں گا یا اسی لکیر کا فقیر رہوں گا۔ اس کا علم خدا کو ہے۔

ماں باپ کا مذہب شیعہ تھا۔ دو تین سال ہوئے محرم مجالس، تعزیہ داری وغیرہ یک قلم چھوڑ دی۔ سُنی احباب اور اعزا نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا سنی ہوگئے؟ لکھنے والے نے جواب دیا کہ اگر سنی ہونا ہوتا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔ اب دعا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ مسلمان مرے اور مسلمان اٹھے۔ آمین۔

دو شادیاں کیں اور بہت سی کرنے کی آرزو رہ گئی ؎

آتا ہے حسرتِ غمِ دل کا شمار ..... یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اپنے چھوٹے چھوٹے عیوب نہایت چالاکی سے ظاہر کر کے بڑے بڑے عیوب چھپا جاتا۔ انانیت سے ظاہر امتنفر ہے۔ جیسا کہ شاید اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہو۔ مگر اپنا ذکر ذکرِ حبیب کے برابر دلاویز پاتا ہے۔ خود لکھنے والے کا خیال ہے کہ جو کچھ نیک نامی، بدنامی، شہرت، گمنامی اس کو نصیب ہوئی وہ صرف Sense of humour کے دربار سے عطا ہوئی۔ نوجوانوں کا ادب کرتا ہے کیونکہ آئندہ کی امیدیں اُن سے وابستہ ہیں۔ اگر کسی بڈھے کی موت سنتا ہے تو کہتا ہے کہ بڑھاپے کی یہی سزا ہے۔

میں اپنے زعمِ ناقص میں اپنا مختصر افسانہ "تیسری جنس" بہترین کوشش سمجھتا ہوں۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔ موضوع عام راہ سے کچھ علیحدہ ہے اور اڈیٹر ادبی دنیا نے بہت تعریفیں لکھی ہیں۔ دوسرے حضرات نے بھی مجھ سے اس کی تعریف کی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ چار آنکھوں کی مروّت سے کی ہو۔

دیوندر ستیارتھی

اپنے حالات کیسے لکھوں گا؟ "کنگ بوش" افسانے رہے ہوں تو حالاتِ زندگی کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ کیونکہ یہ میری آپ بیتی کا ایک جیتا جاگتا ورق ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

مجھ میں جو اپنی ذات کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کے تمام تر قصوروار آپ ہی ہیں۔ یہ جان کر کہ ہمارے جیتے جی ہمارے زندگی کے حالات پوچھے جا رہے ہیں اپنی عظمت میں یقین ہونے لگتا ہے اور ہمارے سفلی جذبات کس قدر آسودہ ہوتے ہیں۔ آخر آپ کیوں محققین ـــــ یا کراماً کاتبین کا کام آسان کر رہے ہیں؟ نوٹ بجے زندگی کے حالات حاضر ہیں۔ اس میں جو چھوا پن دکھائی دے اسے نظر انداز کر دیں ـــــ

میں راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو بمقام لاہور چھاؤنی پیدا ہوا۔ تخواہ ملنے کا دن تھا۔ ظاہر ہے کہ گھر میں سب لوگ خوش ہوں گے۔

بچپن کا پہلا حصہ دیہات میں اور بقیہ شہر لاہور میں گذرا۔ کچھ عرصہ ایک ریاست میں رہا۔ شمال میں تو دزہ خیبر اور جنوب، مشرق میں علی گڈھ سے آگے نہیں گیا۔ ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ ریاضی میں ہمیشہ اتنا ہی کمزور رہا جتنا ادبیات میں اچھا۔

والد کھشتری تھے، والدہ برہمن ـــ ذات پات کی تمیز کے باوجود ان دونوں میں ان کی شادی کیوں کر ہوئی یہ آج تک صیغہ راز میں ہے (اور اس راز کو افشا کرنے والے ان دنوں دوزخ یا جنت میں پڑے ہیں) اتنا جانتا ہوں کہ اتصال غیر رسمی تھا۔ والد صاحب خوبصورت انسان تھے اور والدہ صاحبہ بدصورت۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ شکل کے اعتبار سے دونوں میں جو چیز بُری تھی وہ ہم بہن بھائیوں کے حصہ میں آئی۔

شکلوں میں اس تضاد کے باوجود میرے والدین میں بہت ہم آہنگی تھی۔ اور اس کا وجود ہی اس کا نتیجہ محض نہیں بلکہ اس اتصال سے جو کچھ برآمد ہوا وہ میرے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

افسانے ہیں ـــــ والد صاحب رات کو دیر تک دو پیسے روزانہ کرایہ کے ناول شرلاک ہو مزے کے کارنامے اور ٹاڈ راجستھان ہماری والدہ کو سنایا کرتے تھے اور ہم بستروں میں دبکے ہوئے سُنا کرتے۔

والد صاحب کی دو عادتیں مجھے بیک وقت اچھی اور بُری لگتی تھیں۔ بات بات پر فارسی کے اشعار کا حوالہ اور پڑھتے پڑھتے رونے لگنا۔ اور والدہ کی ان کی سہیلیوں میں ہر دلعزیزی۔ ہمارے گھر میں بہت شور بپا ہوتا تھا۔ شور، شور، شور اور اس کے بعد یک لخت رات کا سناٹا۔ اور پھر بڑا شور دکھائی دیتا تھا۔

انگریزی اور پنجابی میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ پیدا کرنے کی غرض سے اردو میں لکھنے لگا۔ پہلا مقبول افسانہ "بھولا" تھا جو "ادبی دنیا" کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "گرم کوٹ" "ہمدرد" اور "پان شاپ" وغیرہ تھے۔ پھر "دانہ ودام" شائع ہو کر مقبول ہوئی۔ اتنی مقبول کہ اردو کی متعدد کتابوں کی طرح تین سال میں اس کی ایجزار کی ایڈیشن نہیں بک سکی۔

انقلاب و تبدیلی کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتا ہوں۔ طبیعت میں تلون ہے۔ ایک جگہ بہت دیر نہیں بیٹھ سکتا۔ اپنے کمرے میں میز کو کبھی اس طرف اور کبھی دوسری طرف رکھ دیتا ہوں۔ چنانچہ پہلے پوسٹ آفس میں ملازم تھا۔ آٹھ سال کی ملازمت کے بعد پوسٹ آفس چھوڑ دیا کچھ آوارہ گردی کی اور پھر ریلوے ملازم ہو گیا۔ اور اب .....

میں محض افسانے نہیں لکھتا۔ میرے تین بچے ہیں، ایک مرچکا ہے۔ ایک بیوی ہے۔ گو ادب میری پہلی محبت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی امیر بیوہ مجھ سے دوسری شادی پر رضامند ہو جائے، یا کوئی متمول آدمی مجھے متبنیٰ بنالے تو میں آرام سے بیٹھا لکھا کروں یا خوب سیر و سیاحت کروں۔

افسانہ "دس منٹ بارش میں" مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں طبقاتی کش مکش اور سرمایہ دار کی ہوس رانی اور غریب کی بیچارگی اور بے بسی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ افسانہ ٹیکنگ کے اعتبار سے مغربی معلوم ہونے کے باوجود پس منظر کے نقطۂ نگاہ ایک خاص مشرقی چیز ہے۔

رشید جہاں

میرے حالات کیا ہیں؟ میرے والد شیخ محمد عبداللہ ہیں اور والدہ کا نام وحید جہاں بیگم تھا جو عبداللہ بیگم کہلاتی تھیں۔ میرے اوپر صرف ادب ہی اثر نہیں پڑا ہے بلکہ ہندوستان کے ماحول کا۔ عورتوں کے حقوق کے سوالوں کا، ہندوستان کی آزادی کا، دیگر مذہبوں کا، اور سب سے زیادہ انسانوں کو جاننے اور ان سے ملنے جلنے خیالات کرنے اور ان کے حالات کا مطالعہ کرنے کا پڑا ہے۔ میں نے گرلز مسلم کالج علی گڑھ میں میٹرک کی تعلیم پائی ہے۔ اور اس زمانہ میں اپنے ماں اور باپ کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔ رسماً نہیں بلکہ ساری دُنیا جانتی ہے کہ ان دونوں نے کس جوش اور خلوص سے اس کالج کو بنایا ہے۔ اور یہاں صرف امیر اور درمیانے طبقہ کی لڑکیاں ہی نہیں پڑھتیں بلکہ غریب بھی۔ ہمارے اسکول میں ایک بات ہے جو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ خواہ لڑکی فیس دے یا وظیفہ سے پڑھے ایک دفعہ اسکول میں ہو تو اس میں کوئی جمع و تفریق نہیں کی جاتی۔ سب کو ایک ہی کھانا ملتا تھا۔ ایک سا سلوک ہوتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے اردو میں کئی مذہبی پیشواؤں کی زندگی کے حالات پڑھے۔ اسکول میں میں کافی زبردست نیشنل خیال رکھنے لگی تھی۔ نذر سجاد صاحبہ اور منشی پریم چند اور مسز ہنری دو ڈھ مجھ کو بہت پسند تھے۔ پھر الہ آباد تھوبرن کالج لکھنؤ میں الیف سی کیا۔ اور یہاں پہلی دفعہ مذہبوں کو عقل کی ترازو سے ناپ تول کرنے کا اتفاق ہوا۔ اور سخت تعجب ہوا کہ جس بات کے لیے ایک مذہب والے دوسروں کو بُرا کہتے ہیں وہ خود نقص ان میں موجود ہیں۔ شوشل سروس جس کی گود میں پلی بڑھی تھی اور کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ یہاں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آکر سمجھ میں آنے لگی۔ اس زمانے میں میں نے پہلا افسانہ انگریزی میں لکھا تھا جو کالج میگزین میں چھپا اور بھی کئی چیزیں لکھیں چند کالج میگزین میں چھپیں اور باقی نہیں۔ اس زمانہ میں میں نے کالج لائبریری سے کافی فائدہ اٹھایا۔ اور مجھ کو اب خیال آتا ہے کہ ڈکنس، ٹیگور، جین آسٹن مجھ کو بہت پسند تھے اور دل چاہتا تھا کہ جین آسٹن کی طرح لکھنے لگوں۔ مجھ کو اب بھی جین آسٹن بہت پسند ہے۔ یہاں میرے نیشنل خیالات ویسے ہی رہے جیسے کہ اسکول میں۔ بس ہندوستان آزاد ہوا اور گاندھی جی کی میں زبردست چیلی تھی۔

پھر میں لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج میں گئی۔ اور ڈاکٹری پاس کی۔ اور غالباً میری آیندہ کی زندگی اسی ڈاکٹری کی وجہ سے آج ایسی ہے۔ میری طبیعت میں کھوج ہمیشہ سے ہے اور اس سائنس نے جستجو کو اور بڑھا دیا۔ زیادہ لوگوں سے ملے، زیادہ گھروں میں جانے، غربت سے دوچار ہونے کا بہت موقع ملا۔ کالج کی انگریز استانیاں اتنی خردماغ تھیں کہ خدا کی پناہ۔ لیڈی ہارڈنگ کا ماحول مجھ کو سخت ناپسند تھا۔ کیونکہ وہ کالج ایسا لگتا تھا کہ ہندوستان میں ہے ہی نہیں۔ اس زمانہ میں میں نے ڈرامے پڑھے اور کالج کے لیے لکھے بھی اور ایکٹنگ بھی کافی کی۔ میں نے اس کالج میں ڈرامے انگریزی اور اردو دونوں میں لکھے۔ تھوڑے سے ڈرامے پڑھے Barry کے ڈرامے کو پسند تھے۔ ہمارے کالج میں ادبی لائبریری نہ تھی کچھ افسانے مردانہ نام رکھ کر چھپوائے۔ مجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کبھی لکھ بھی سکوں گی۔ لہٰذا میں نے کوئی چیز کالج کی جمع کر کے نہیں رکھی۔

۱۹۳۲ء میں پہلی بار سمجھ میں آیا کہ ہندوستان کے لیے کیونزم ہی ایک نجات کا راستہ ہے۔ اور اسی سال میں سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی۔ اور ۱۹۳۳ء میں "انگارے" میں انھوں نے میرے دو مضامین چھاپے۔ اور پہلی مرتبہ میرے اپنے نام سے یہ چیزیں چھپی تھیں۔ اس زمانہ میں میں نے منشی پریم چند کو بہت پڑھا۔ اور ٹالسٹائی کو اور ایلس ہیولوک کو۔ اور میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف برنارڈ شا

رہا ہے۔ کیونکہ مجھ کو ڈرامہ نگاری سے بہت شوق ہے بہ نسبت افسانہ نگاری کے میں پچھلے دس سال میں جب سے میں نے پردہ چھوڑا ہے ہندوستان کے کئی ادیبوں سے مل چکی ہوں اور سیاسی رہنماؤں سے بھی۔ اور اب میں اپنے اف فنوں میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ جو میرے خیال ہیں ان کی ترجمانی ایمانداری کے ساتھ کروں۔

میرا ایک مجموعہ "عورت" چھپا ہے اور "نیا ادب" اور "ادب لطیف" میں اکثر میرے افسانے اور ڈرامے نکلے ہیں۔

یہ افسانہ مجھ کو کیوں پسند ہے؟ معلوم نہیں! ایک ماں کو سب بچے یکساں نہیں پیارے ہوتے۔ اسی طرح ایک مصنف کو بعض چیزیں اچھی لگتی ہیں۔

سعادت حسن منٹو

عجیب اتفاق کہ آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں میری سالگرہ کا دن ہے۔ میری بیوی کا اور میرا جنم دن ایک ہی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یاد نہیں رہتا اس لیے میں نے اس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج ہی کے دن میں پیدا ہوا تھا۔ یہ غالباً میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے جو ہندوستان کے متعدد اخبار نویسوں کو ۱۹۲۵ء سے پیش آ رہا ہے، جب میں نے پہلی بار اپنا گندگی کریدنے والا قلم اٹھایا تھا۔

میری تعلیم انٹرنس تک ہے جو میں نے تین بار فیل ہو کر پاس کیا تھا۔ ان لوگوں نے جو ادب کے پلیٹ فارم پر آنے جانے والے کا ٹکٹ چیک کرتے ہیں میرا داخلہ قبول کر لیا ہوتا تو بہت ممکن ہے میں نے امرتسر میں جہاں میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا ہے ٹرکوں کی دکان کھول لی ہوتی یا ایک ودچ کر کے کوئی نفع بخش کاروبار شروع کر دیا ہوتا۔ اس طرح ان تمام کاغذوں کی بچت ہو جاتی جن پر مجھے گالی دی جاتی رہی ہے۔

میرے تشخص اور میرے ادب کی تشکیلی اثرات میں صرف ایک چیز کا رفرما

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ـــــ یہی گالی جو کبھی سلیقے سے نہیں دی گئی۔

یہ خاص افسانہ پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے میں نے پسند نہیں کیا بلکہ خود مرتب نے کیا ہے۔

عصمت شاہد لطیف

بھئی میرے حالاتِ زندگی قطعی اس قابل نہیں کہ فخریہ بتائے جائیں بچپن بھرے گھر میں پٹتے پٹاتے گذرا۔ تعلیم نہایت بے ڈھنگے پن سے ہوئی۔ اُستاد ہمیشہ کچھ مکدر خاطر سے علی گڈھ اور لکھنؤ میں تعلیم مکمل کی، اے دے کے محکمہ تعلیم ہی ہم عورتوں کا آشرم ہے چنانچہ وہیں پناہ گزین ہوں۔ مطالعہ کا شوق نہایت بے ڈھنگا ہے۔ نہیں پڑھتی تو روزانہ اخبار تک نہیں پڑھتی اور جو پڑھنا شروع کرتی ہوں تو دن و رات ایک ہو جاتے ہیں یہی حال لکھنے کا ہے۔ سال میں ایک آدھ بار لکھنے کا دورہ سا پڑتا ہے اور وہ بھی شستی کے زمانے میں، جب کچھ کام نہیں ہوتا اور جی گھبرانے لگتا ہے تو لکھتی ہوں۔ اور اس قدر تند ہی سے لکھتی ہوں کہ سوچنے کے لیے بھی نہیں رُکتی۔ تنہائی لکھنے کی عادت نہیں چونکہ کبھی نصیب ہی نہ ہوئی۔ غدر مچتا ہوتا ہے، ریڈیو بجتا ہوتا ہے اور بچے کشتیاں لڑتے جاتے ہیں۔ اور میں لکھتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے مضامین میں ایک دوڑ سی آجاتی ہے بشتم پشتم، بھاگم بھاگ مچی رہتی ہے شروع سے لے کر آج تک ایک مسلسل جلد بازی پائی ہے۔

مضامین لکھنے کا شوق تو نہیں تھا۔ ایک دفعہ تہذیب نسواں میں اپنے میرک کرنے کی خبر چھپوانا چاہی مگر سب نے کہا کچھ بیوہ فنڈ کے لیے بھیجو تب چھپے گا کیونکہ والد صاحب جب تک آٹھ آنہ مہینہ خرچ دیتے تھے۔ لہٰذا دل پر پتھر رکھنا پڑا۔

سب سے پہلا مضمون بچپن لکھا تھا جو تہذیب نسواں کو بھیجا۔ جب تک مولوی ممتاز علی صاحب زندہ تھے انھوں نے واپس بتا دی یا شاید امتیاز علی صاحب تھے جنھوں نے لکھا کہ اس مضمون میں تم نے تعلیم قرآن کا مذاق اڑایا ہے۔ لہٰذا بس ارادہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد فسادی لکھا۔ سائی کا عظیم بھائی کی وجہ سے بہت زور تھا گھر میں۔ مگر ڈر لگا کہ اتنا اونچا پرچہ بھلا ہمیں کا ہے کو گنتی میں لائے گا۔ خیر ہمت کر کے شاہد احمد صاحب کو نہایت مسکین بن کر لکھا کہ اگر اس قابل ہو تو چھاپ کر ممنون فرمایئے۔ مگر خدارا میرا نام نہ لکھ دیجئے گا۔

دراصل مجھے بدنامی کا ڈر تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ کس فلدواہیات لکھا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اتنی گمنام ہوتے ہوئے بھی بدنامی کا ڈر تھا۔ شاہد صاحب نے جو جواب دیا تو بدحواس ہونا پڑا۔

"آپ کا مضمون اچھا بلکہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ایک نشست میں ختم کر دیا۔ اسے سالنامے کے لیے رکھ لیا گیا ہے"

آپ سوچیں گے کہ میرے پاس شاید اب تک وہ خط محفوظ ہے۔ جی نہیں جناب مگر الفاظ ایسے دل پر نقش ہیں کہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ماں اپنے پہلے بچے کی پیدائش کبھی نہیں بھول سکتی خواہ خوگیر کی بھرتی کیوں نہ بھر جائے۔ یہ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔

یہ سوال بھی ذرا ٹیڑھا ہے کہ میرا بہترین افسانہ کون ہے جسے دیکھتی ہوں جی چاہتا ہے کہ کلیجے سے لگا لوں۔ آخر یہ کالے، نیلے، پیلے سب میرے ہی دماغ کے ٹکڑے ہیں نا۔ پھر میرا تو دل نہیں چاہتا ان میں سے کسی ایک کو چن لوں اور دوسروں کو پرے ڈھکیل دوں۔ مگر خیر لوگ تو اپنی اولاد کے ساتھ اونچ نیچ کرتے ہیں۔ یہ تو کاغذی غبارے ہیں۔

تو مجھے یہ آپ کے پیش نظر کہانی "تل" ذرا زیادہ پسند ہے۔ کیوں؟ یہ نہایت کوڑھ مغزی کا سوال ہے۔ اور اس کا جواب صرف یہی ہے کہ میری مرضی! ذرا غور سے پڑھئے اسے کیا سمجھے؟ دیکھا آپ نے وہ نکتہ جسے پڑھ کر کسی عورت کے دل میں ایک ہلکی سی فاتحانہ گدگدی پیدا ہو جاتی ہے۔ عورت۔ کیچوا کا حقیر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیڑا۔ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ مگر یہی کیڑا اگھن بن کر دُنیا کے دل و دماغ میں تباہی مچا دیتا ہے۔ ایک ننھا سا بے حقیقت داغ فسادِ خون کا چھوٹا نقص پہاڑ بن کر انسان کی ہستی پر پڑتا ہے۔ چودھری کا سالا غرور، ساری پارسائی اور سارا کوشش اس تل کی سیاہی میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر بھی وہ سمجھتا ہے کہ یہ غلاظت اسے گناہ میں آلودہ کر رہی ہے۔ وہ بردباری اور شرافت کے تیزاب سے اسے دھو ڈالنا چاہتا ہے۔ داغ دُھل جاتا ہے مگر وہ "مرد" جو ستون کی طرح اسے تھامے ہوئے تھا کچے رنگ کی طرح دُھل کر بہہ جاتا ہے۔ وہ لوگ جو عورت کو کھلونا کہتے ہیں بڑے اس کے جذبات کو اور حیات کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اس ننھے سے تل کے اندھیرے میں کچھ ٹٹول سکتے ہیں! ذرا اتنا یاد رہے کہ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ بھی کالے اور منہ بھی کالا!

حالاتِ زندگی کے سلسلے میں شاید مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ شادی کب کی؟ مگر یہ بتانے میں مجھے بہت نقصان کا احتمال ہے۔ کیونکہ حال ہی میں ایک نقاد صاحب نے فرمایا ہے کہ جب سے میں نے شادی کر کے ہنڈیا چولھا سنبھالا ہے۔ میرے مضامین میں وہ شگفتگی اور زندگی نہیں رہی۔ اگر آپ کو معلوم ہو گیا تو آپ حساب لگا کر نہ جانے میرے کون کونسے افسانے ردی کی فہرست میں داخل کر دیں گے۔ اور بہت ممکن ہے پھر یہ تل بھی آپ کو کڈھ کا داغ معلوم ہونے لگے۔ شادی بیاہ کے بعد دُنیا بدل جایا کرتی ہے مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ادبی دُنیا بھی ان ڈھکوسلوں کی قائل ہے۔ اور وہاں بھی حصے بخرے کرتے وقت کنواری، بیاہی اور بیوہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔

علی عباس حسینی

میں اپنے سوانح کے متعلق کیا عرض کروں۔ انیسویں صدی کے آخری حصے میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں اس طرح کی تربیت و تعلیم پائی جو سادات مولوی گھرانوں کا دستور ہے۔ یعنی عربی اور دینیات کی کتابیں۔ روزہ نماز کی پابندی۔ پھر گھر والوں نے یہ دیکھ کر کہ ملائے مسجد بننے کی زیادہ صلاحیت نہیں ہے انگریزی پڑھنے کی اجازت دیدی ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے پاس کیا، ۱۹۲۱ء میں ال۔ ٹی کیا اور کارِ مدرسی کرنے لگا۔ بعد میں تاریخ میں ایم۔ اے بھی کر لیا۔ قصہ کہانی سے ابتدا ہی سے شوق تھا چنانچہ دس گیارہ برس کے سن تک سات بار اردو میں الف لیلہ پڑھ گیا تھا۔ اور اتنی ہی دفعہ اردو میں شاہنامہ فردوسی کا منظوم ترجمہ اس زمانہ عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب کا بڑا زور تھا۔ اور گھر میں ان دونوں کی سب کتابیں موجود تھیں۔ بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر ان کی ساری تصنیفات، دوسرے ناول، قصے، طوطا مینا کی کہانیاں، مثنویاں، واسوخت سب کچھ عنفوانِ شباب کے پہلے ہی پڑھ ڈالے۔ انگریزی تعلیم کے سلسلے میں نویں درجے سے اب تک یہ معمول ہے کہ کم سے کم ایک نیا ناول ہر ہفتے ضرور پڑھتا ہوں۔ اس طرح دُنیا کی ہر اس زبان کا ادب پڑھ گیا جو انگریزی منتقل ہو گیا ہے اور اب بھی لکھنے پر مطالعہ کو ترجیح دیتا ہوں۔

خود میں نے سب سے پہلی کہانی "غنچۂ ناشگفتہ" کے نام سے ۱۹۱۷ء میں لکھی۔ پھر ۱۹۱۹ء تک اس طرح کا کوئی کام نہ کیا۔ ۱۹۲۰ء سر سید احمد پاشا کے نام سے ایک رومانی ناول لکھا۔ لیکن یہ غیر مطبوعہ صورت میں پڑی رہی۔ سب سے پہلا افسانہ "جذبِ کامل" ۱۹۲۴ء میں زمانہ کانپور میں شائع ہوا۔ اور جب سے اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انہی رسالے والوں کے اصرار سے یا احباب کے حکم سے۔ میں نہیں جانتا کہ میں ترقی پسند ہوں بھی یا نہیں۔ اگر "انسانیت" کی تبلیغ ترقی پسندی ہے تو میں یقیناً ترقی پسند ہوں۔ اگر اس کے معنی مارکس کے فلسفے کو الہامی سمجھنا ہے تو میں یقینی ترقی پسند نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مشکک ہوں۔ نہ کمیونزم میں یقین رکھتا ہوں نہ سوشلزم کو بے عیب جانتا ہوں اور نہ کسی ایک نظریۂ حیات یا مذہب کو بس ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی اپنے گھر کو ۔۔۔ میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں آرٹسٹ کا کام مصوری اور دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ دینا سمجھتا ہوں۔ نظرات کا پرچار مبلغ کا کام ہے اور ان کو عملی جامہ دینا مقنن کا۔ میں اس سے واقف ہوں کہ مجھ پر الزام ہے کہ میرے فسانوں میں "حرکت" نہیں ہے اور میرا ذہنیت مصلحانہ ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں، جتنا پڑھتا ہوں اتنی ہی تشکیک بڑھتی جاتی ہے جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی عدم تیقن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ غالباً ان تمام چیزوں کی ذمہ دار پچھلی تربیت تعلیم، ملازمت کی زنجیریں، عمر کی اور تجربے کی زیادتی ہے۔ میں آپ سے نوجوانوں کی طرح کا یقین واثق کہاں سے لاؤں۔ اگر آپ نے ہمپٹن کا "اف ونڈرکس" پڑھا ہو تو آپ کو اس کے ہیرو کا کیریکٹر یاد ہوگا۔ وہ غریب اپنے مخالف کے نظریہ میں بھی بہت حد تک صداقت کی جھلک دیکھ لیتا تھا۔ میں بھی اسی مرض میں گرفتار ہوں۔ میرے لیے یہ ناممکن سا ہوگیا ہے کہ میں یہ سمجھ لوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے اور جو کچھ دوسرے کہتے ہیں وہ سراسر غلط ہے۔ غرض یہ ہیں میرے "Moods" نظریے، حالات، افکار، آلام، پابندیاں۔ آپ خود نقد کا بار اپنے سر کیوں نہیں لیتے۔ یہ بیچارے مصنفوں کو کیوں پریشان کرتے ہیں میرے بارے میں آپ یقین کہ بہت ہی میاں قسم کا آدمی ہوں، اور میرے ہاں بہت کافی INFERIORITY COMPLEX ہے۔ بہرحال اب "می سرایم"

مجھے "ہار جیت" اس لیے پسند ہے کہ (۱) وہ میری تصنیف ہے، میرے ہی دماغ کی کاوش وتخلیق! (۲) وہ مجھے ایسی فضا کی یاد دلاتا ہے جس میں میرا بچپن گذرا ہے۔ جب میں گاؤں کے پوسٹ کی حیثیت سے اہیروں کی براتوں میں شرکت کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اور آموں کے باغوں میں چیر کھٹ پر "براجمان" ہوکر اہیروں کے کھیل اور مقابلوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اور (۳) وہ مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ وہ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کے تذکرہ پر مبنی ہے جس میں اب بھی حرارت ہے۔ زندگی ہے اور کچھ کچھ مردانگی ہے۔ اور تھوڑی سی توجہ اور تعلیم نہ معلوم کیا سے کیا بنائی جاسکتی ہے۔

غلام عباس

نومبر ۱۹۰۹ء کی سترھویں تاریخ کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی۔ اگرچہ بہت کم عمری ہی میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ مگر صحیح معنوں میں ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا جبکہ میری سب سے پہلی ادبی چیز اس وقت کے مشہور رسالہ "ہزار داستان" میں شائع ہوئی۔ یہ ٹالسٹائی کے ایک افسانہ کا ترجمہ تھا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک کا زمانہ زیادہ تر غیر ملکی ادب کے پڑھنے اور افسانوں کا ترجمہ کرنے میں گزرا۔ اسی زمانہ میں بچوں کے لیے چند کتابیں بھی لکھیں جنہیں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔

۱۹۲۸ء سے سید امتیاز علی صاحب تاج کے نائب کی حیثیت سے "پھول" اور "تہذیب نسواں" کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگا۔ جن کا سلسلہ ۱۹۳۷ء تک یعنی پورے نو سال رہا۔

۱۹۲۹ء میں حضرت تاج کی فرمائش پر آر ونگ کی "الحمرا" کے افسانوں کا آزاد ترجمہ کیا۔ اس کی نثر میں نے ایک خاص آہنگ (Rythm) پیدا کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۳۰ء میں مولانا چراغ حسن صاحب حسرت کے ہفت وار اخبار "شہرزاد" کے لیے "جریدۂ سخنوراں" کے عنوان سے ایک طویل طنز آمیز افسانہ مشہور فرانسیسی ادیب آنڈرے موروا کے نہج میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں اس کی مطالب بڑھا کر کتابی صورت میں شائع کیا۔

۱۹۳۸ء سے آل انڈیا ریڈیو کے اردو اور ہندی رسالے "آواز" اور "سارنگ" میری ادارت میں نکلتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یوں تو میں نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ یا فیضِ صحبت حاصل کیا لیکن ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہیں ـــــ ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر جنہوں نے مطالعہ اور فکر میں میری رہنمائی کی۔ خانبہادر عبدالرحمن چغتائی جن کی تصویروں سے آرٹ کی رفعتوں کا احساس ہوا۔ اور مولانا چراغ حسن صاحب حسرت جنھوں نے اردو زبان وسعتوں سے آگاہ کیا۔

میرے محبوب مصنف یہ ہیں۔ غالب۔ اقبال۔ رُسوا۔ گورکی۔ موپاساں اور ڈی۔ ایچ لارنس۔

اب کچھ اس افسانہ کے متعلق جسے میں نے اس مجموعہ کے لیے پسند کیا ہے۔

آنندی۔ اس افسانہ کو پسند کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کی تکنیک عام افسانوں سے مختلف ہے یعنی اس میں ایک دو یا چند کرداروں کی کردار نگاری نہیں کی گئی بلکہ شہر کے شہر کو اپنی پوری دلچسپیوں اور گہما گہمیوں کے ساتھ عدم سے وجود میں آتا اور تجدیج رستا بستا دکھایا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں طنز کے پیرایہ میں زندگی کا ایک فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔

جنگ اور صلح، ظلم اور انصاف، گناہ اور ثواب کے خواص روزِ ازل سے ابنِ آدم کی سرشت میں داخل ہیں۔ اور دُنیا کی بھلائی اور انسانی فطرت کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ خواص ابتک اس میں موجود رہیں۔ اگر دو چار، دس بیس حکمراں مل کر یہ کوشش کریں کہ دُنیا میں ہمیشہ کے لیے امن قایم ہو جائے، یا صدہا پیغمبر اور ان کے حواری آکر یہ چاہیں کہ انسان فرشتوں کی طرح معصوم ہو جائیں۔ تو یہ اَن ہونی سی بات ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ فوری طور پر صلاح ہو جائے۔ یا کچھ عرصہ کے لیے شرّ خیر کی شکل اختیار کرلے۔ مگر بدی کا خمیر اندر ہی اندر پکتا رہے گا۔ اور ایک نہ ایک دن موقع پاکر جوالا مکھی کی طرح پھوٹ نکلے گا۔

"آنندی" میں ملک و قوم کے چند سچے خیر خواہ اور دردمند اپنے شہر سے بدی (زنان بازاری) کو نکال کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا مگر زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پاتا کہ بدی ان کے پڑوس ہی میں ایک نئے اور زیادہ دلاویز روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور شہر کے "پاکبازوں" کو پہلے زیادہ دلفریب طریقے سے لبھاتی اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔

کرشن چندر

پیدائش:۔ دسمبر ۱۹۱۲ء

تعلیم:۔ فورمن کرسچین کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم اے اور بعد میں لا کالج لاہور سے ۱۹۳۷ء میں ال ال بی کیا۔

۱۹۳۰ء تک انگریزی لکھاری "ٹریبون" "رائٹر ویکلی" ادبی، معاشی اور اقتصادی مسائل پر مضامین چھپتے رہے۔

۱۹۳۷ء میں انگریزی اشتراکی ہفت روزہ "نادرن ریویو" پروفیسر السن کے السن سکھوں کے ساتھ مل کر نکالا۔

۱۹۳۷ء کے اواخر میں اردو میں لکھنا شروع کیا۔

کتابیں:۔ طلسم خیال، نظارے، ٹوٹے ہوئے تارے۔ کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ "ہوائی قلعے" مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔

۱۹۴۲ء ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی نمایندہ کتاب "نئے زاویے" کو مرتب کیا۔ پہلا ناول "شکست" جنوری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

ممتاز مفتی

۱۹۰۶ء میں بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوا۔

شاید اس لیے کہ میں کثرتِ ازدواج کا بیٹا ہوں۔ پچپنے سے میری طبیعت میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کئی قسم کے جھجک اور ڈر موجود تھے۔ مثلاً میں بلندیوں سے ڈرتا تھا۔ تنگ جگہوں میں میرا دم گھٹتا۔ محفل سے گھبراتا اور لوگوں کے روبرو بہت جھینپتا۔ اسکول سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ وہاں آنکھوں کے اتنے جوڑے میری طرف اٹھتے تھے۔ باشاید اس لیے کہ ابا وہاں بھی افسر تھے۔ اس جھجک اور ڈر کے خلاف میرے میرے دل کی گہرائیوں میں ایک مدھم سی صدائے احتجاج اٹھتی اگرچہ وہ احساس احتجاج دبا دبا تھا۔ باشاید اس لیے کہ دبا دبا رہا۔ میرے نفس غیر شاعر میں اپنے آپ کے خلاف اور شاید حالات کے خلاف بھی ایک بغاوت سی جمع ہوتی رہی۔

کالج میں یہ مصیبت تھی کہ وہاں اتنے لوگ تھے کہ جنھیں میری طرف دیکھنے کے سوائے شاید اور کوئی کام نہ تھا۔ اس کے علاوہ لاہور ایک جیتا جاگتا بکھیڑا تھا اسی لیے میری کالج کی تعلیم پریشان رہی۔ تمام لاہور میں جو اطمینان کی جگہ مجھے نصیب ہوئی وہ کسی نہ کسی سنیما ہال کے جو تھے درجے کے کسی نہ کسی اپنے کونے میں ہوئی جہاں تماشائی بیٹھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ سنیما کے تماشائیوں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں چادر کے علاوہ ادھر ادھر دیکھنے کی عادت نہیں ہوتی۔ اور ہال میں زیادہ تر ایک ہمدردانہ اندھیرا چھاتے رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان دنوں کے فلم یوں چیختے چلاتے نہ تھے۔ تو حقیقی طور پر میری تعلیم کی ابتدا سنیما کا خاموش پردہ تھا۔ چونکہ اسکول اور کالج میں پڑھائی سے مجھے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اور میں جماعت میں ان لڑکوں میں سے تھا جو شاید جاننا چاہتے تو ہیں مگر پوچھنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

حالانکہ بالپن میری طبیعت اور جذبات پر قطعی طور پر عادی ہو چکا تھا لیکن تعجب کی بات ہے کہ میرا دماغ ابتدا ہی سے اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ بالغ تھا۔ اگرچہ میری زندگی مکمل طور پر جذباتی اور دماغی دو رخے یا تضاد بینات خود ایک بکھیڑا تھا۔ دو ملاؤں میں مُرغی حرام کا سا بکھیڑا۔

کالج کے دوران ہی میں میرے دل میں وہ دبا دبا احساس احتجاج اس شعوری خواہش کی صورت میں ظاہر ہوا کہ میں ایک معقول آدمی نظر آؤں۔ اس کے علاوہ گھر کے حالات بھی اسی بات کے مقتضی تھے کہ مجھے ایک فرد مانا جائے چونکہ گھر والے میرے خیالات کی معقولیت اور میری انفرادی شخصیت سے قطعی منکر تھے۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ میری طبیعت میں ایک کش مکش پیدا ہو گئی۔ اور میں عرصہ دراز تک اپنے آپ سے برسرپیکار رہا۔ اس خواہش کے زیر اثر میں نے بڑی محنت سے ماتھے پر ایک سنجیدگی کی جھرّیاں پیدا کیں۔ اور سوچ وچار کا بہروپ دھارنے کے لیے چہرہ روز بروز لمبا ہوتا گیا۔

گھر میں اپنی اہمیت پیدا نہ کر سکا تو تسلی کے لیے میں نے بڑی محنت سے ایک جذباتی بھنور پیدا کر لیا جس میں ایک عرصہ تک ڈبکیاں کھاتا رہا۔ آخر وہ بلبلا پھٹا۔ اور عین اس وقت ایک دوست نے میرے ہاتھ میں ایک کتاب دے دی۔ اس روز سے میں نے مطالعہ شروع کیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ میں نے اس غرض سے مطالعہ نہیں کیا کہ حقیقت کو سمجھوں۔ بلکہ مطالعہ میرے نزدیک ایک قلعہ تھا جس میں مجھے حقائق سے پناہ ملتی تھی کہ تعجب ہے کہ مجھے ٹھوس مضامین فلسفہ، نفسیات، جذبات اور سائنس میں بہت دلچسپی رہی۔

۱۹۲۹ء میں میں نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد مختصر نویسی اور ٹائپ سیکھا لیکن ان دنوں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی مرد اسٹینوگرافر کی ضرورت نہ تھی۔ مجبوراً مجھے ٹریننگ حاصل کر کے ٹیچر بننا پڑا۔ اور آج تک ایک ٹیچر ہوں۔

سب سے پہلی کتاب جو میرے ہاتھ لگی وہ اناطول کی "تائیس" تھی۔ اس کے بعد حسن اتفاق سے چلتا چلاتا "ڈال ہاؤس" سے ہوتا ہوا دستووسکی کے "ایڈیٹ" تک پہنچ گیا۔ دستووسکی کے مطالعہ پر مجھے ایک تسلی سی ہوئی۔ چونکہ اس کے کردار میری طرح کسی نہ کسی طبی تضاد کے شکار ہونے کے علاوہ رسمی افراد کے برعکس بے بس تھے۔ اور ان کے متعلق یقین سے کچھ نہ کہا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد مجھے ڈاکٹر فرائڈ سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

واقفیت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی وہ کتاب جس نے مجھ پر بے حد اثر کیا "PSY HOPATHO LOGY OF EVERY DAY LIFE" تھی۔

ڈاکٹر فرائڈ، اسٹیکل، یونگ، ایڈلر اور ڈالٹن کی تصنیفات پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں نہ آیا کہ تحلیلِ نفسی کے اختلافات واقعی ایسے گہرے تھے جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا۔ بہرحال ان تمام علمی تصنیفات میں CAS HISTORICO میرے لیے مشعلِ راہ ہو گئیں۔ ان CAS HISTORICO کی جستجو میں میں جنسیات پڑھنے پر مائل ہوا۔

فلسفہ میں مجھے برٹرینڈ رسل، سپرنجیز، ہالڈین، سنتایانہ اور نیٹشے نے بے حد متاثر کیا، اور کہانیوں میں ڈی ایچ لارنس، ویلز، کانٹکا، پیری لوئی اور پراوسٹ نے مجھ پر اثر کیا۔

۱۹۳۴ء میں ن۔م۔ راشد نے مجھے لکھنے پر مائل کیا۔ میرے پہلے دو ایک مضامین "نخلستان" میں چھپے اور پھر ۱۹۳۶ء میں میری پہلی کہانی "جھکی جھکی آنکھیں" کے عنوان سے ادبی دنیا میں چھپی اور پسند کی گئی۔

میرا مصنف ہونے کا جواز یا بہانہ صرف یہ ہے کہ میں نفسِ غیر شاعر کے رجحانات پر لکھتا ہوں۔ اگرچہ آج تک زیادہ تر میری وہ کہانیاں پسند کی گئی ہیں جو میرے موضوع سے ہٹ کر ہیں۔ میری کہانیاں زیادہ تر گردوپیش کے کسی واقعے پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور میری سب سے بڑی مشکل کسی غیر شعوری رجحان کو احاطۂ شعور میں لانا ہوتا ہے جو لازمی طور پر کہانی کا CLIMAX ہوتا ہے۔

"ماتھے کا تل" کے چناؤ کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ کہانی میرے موضوع یعنی نفسِ غیر شاعر (THE UNCONSCIOUS) سے تعلق رکھتا ہے۔ سعید کو حقیقی طور پر اپنی بہن تبسم سے عشق ہے۔ اگرچہ وہ اپنے جذبات کو یوں احترام کے پردے میں چھپا چھپا کر رکھتا ہے کہ وہ کہیں خود اپنے اس راز سے واقف نہ ہو جائے۔ تسلیم کی آڑ یا پردے میں اسے تبسم کی آرزو ہے۔

تبسم کے ماتھے کا تل۔ اس کی چوڑی۔ اس کا چوڑا ماتھا اور چند ایک مزید تفصیلات اس بات کی شاہد ہیں۔ اس کے علاوہ سعید کا وہ ایک بار تسلیم کو تبسم سمجھنا بھی کی غلط فہمی نہیں بلکہ خوش فہمی یا مستور آرزو ہے۔

آخری سطور میں سعید کا تسلیم کے ماتھے پر بنا ہوا سا نقطہ مٹانے کی بجائے تبسم کا نقطہ کھڑچ کر اس کا فوٹو سرہانے رکھ لینا ایک واضح کن تفصیل ہے جس سے دفعتہً تبسم پر حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے اگرچہ شاید سعید کو شعوری طور پر یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنی بھابی کی آرزو میں گھل رہا ہے۔

نہ جانے ہم سب کس کس کے پردے میں (اوٹ) کس کس کی آرزو کرتے ہیں۔

محمد حسن عسکری

میرے بیان کو پڑھ کر شاید آپ کہیں گے کہ میں نے کئی کاٹ کر نکل بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آخر میں پھنس ہی گیا۔۔۔ اور اپنے ہی جال میں۔

اوّل تو میری عمر کے آدمی کو اپنے حالاتِ زندگی کے بارے میں باتیں کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ کیونکہ خارجی واقعات کی اہمیت کا انحصار ہے ان کی تفسیر و تعبیر پر، اور اس عمر میں، بغیر ایک پوری زندگی کے تجربات کو نظر میں رکھے، کسی واقعے یا فعل کی تعبیر اور زندگی پر اس کے ردِعمل کا اندازہ کرنا محض ایک خودپرستانہ مغالطہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یقین نہ کیجئے کہ میرے پاس کوئی "مزے دار" بات سنانے کو ہے بھی نہیں۔

سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یقینی طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ محمد حسن عسکری کون ہے۔ لیکن جس بدن کو لوگ محمد حسن عسکری کہتے ہیں اس میں ہر انسانی جسم کی طرح ایک آدمی نہیں بستا بلکہ کئی، جو اپنے رجحانات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اور کبھی ان میں سے کوئی مرجاتا ہے، کبھی کوئی نیا پیدا ہوتا ہے، کبھی وہ ایک دوسرے میں گھل مل کر اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں۔ کبھی ایک اپنے جنون و دارفتگی میں اتنی گرد اڑاتا ہے کہ دوسرے بالکل چھپ جاتے ہیں، اور کبھی ہر ایک اپنی شخصیت منوانے پر ایسا تل جاتا ہے کہ ان کے پھیلاؤ سے قفس کی تیلیاں لرز جاتی ہیں، ٹوٹتی معلوم ہوتی ہیں۔ میں ان سب عسکریوں کے حالات لکھنے کی ہمت کر بھی لوں مگر مجھے تو ان کی گنتی بھی نہیں معلوم۔ اور صرف ایک عسکری کے بارے میں لکھنا نہ صرف دوسروں کے ساتھ بے انصافی بلکہ سفید جھوٹ ہوگا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میں اس عسکری کے بارے میں کیوں نہیں بتا دیتا جس نے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن افسانے تو ایک سے زیادہ ہیں۔ اور ان میں ایک سے زیادہ عسکریوں کا ہاتھ ہوگا۔ اب کہیے؟

شخصی اور ادبی اثرات یہ بھی بڑی سیال چیزیں ہیں۔ آسانی کے لیے ہم چند نام چن تو لیتے ہیں، مگر ان تمام چہروں، آنکھوں، اڑتے ہوئے جذباتی سایوں اور فضاؤں کو کون گنے گا۔ جو یوں ہی چلتے پھرتے ہم کو نظر آجاتے ہیں، مگر جنہیں دیکھ کر ہمیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کائنات میں ایک نئی دنیا ابھر آئی ہے، اور جو ہماری زندگی کو کمہار کے ہاتھوں کی طرح ڈھالتے ہیں۔ (یہ جنبی کشش رکھنے والے چہروں کا ذکر نہیں تھا صاحب، یہی حال ادبی اثرات بھی ہے۔ کسی تیسرے درجے کی فلم میں سنا ہوا کوئی فقرہ، کسی اشتہار کا کوئی جملہ، کسی گھٹیا مصنف کی روح کا ایک مختصر ترین لمحے کے لیے اپنی معذوریوں اور لاچاریوں میں سے چھٹ پڑنا ——— آخر یہ سب چیزیں بھی تو ہمارے اندر کیمیاوی تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں۔ جی ہاں، کیمیاوی تبدیلیاں! آخر وہ خیال وہ جذبہ ہی کیا جس سے ہمارے اندر دو چار رنگ نہ مرجائیں۔ اور دو چار نئے پیدا نہ ہوں ——— جس سے ہمارے معدے اور ہاضمے پر اثر نہ پڑے؟

میں نے حرام جادی کا انتخاب اس وجہ سے کیا ہے کہ اور افسانوں میں تو سارے کے سارے عسکری ایک دوسرے سے کھنچ تان کرتے رہتے تھے، مگر نسبتاً یہاں ان کی زیادہ تعداد کو میں نے افہم دے کر سلا دیا تھا، اور اگر دو ایک کو تھوڑا سا ہوش تھا بھی تو قوی مدافعت کر سکنے کی حد تک نہیں۔ ہے تو یہ فریب، بلکہ حیثیتوں کا سا فعل، مگر یہی فریب دہی، یہی سفاکی آرٹ ہے۔ کیا کیا جائے آرٹ کی دیوی صرف جھولے ہی کو اپنے سینے پر سلاتی ہے ..... آرٹ تو خیر چھوٹی چیز ہے۔ تہذیب و تمدن ہی سوائے اس فریب اور سفاکی کے اور کیا ہے۔ ہر چیز جسے ہم بڑا کہتے ہیں یہی ہے ——— سب سے زیادہ محبت ..... Aaram محبت سے دعا مانگی ہے! انسان کے دل کی دھڑکن کو روزانہ سادہ سے سادہ تر بناتے جا! مجھ ایسے تنزل پرست اسے دھوکا کہتے ہیں..... مرے بھر بھی! کاش کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا! کاش نہ انسان پھر سے اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا!

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جزیرے

محمد حسن عسکری کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ تقریباً تمام افسانے مطبوعہ ہیں عسکری اردو افسانہ نویسی میں مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عسکری نے افسانہ نویس کو سنجیدہ ترین صنف بنا دیا ہے۔ کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے افسانے "جدید" ہیں تو عسکری کے "جدید ترین" ہیں۔ "حرام جادی" اور "چائے کی پیالی" کے مقابلہ میں ہمارا بہترین ادب پھیکا اور بے جان نظر آتا ہے۔ عسکری ذہن لاشعور کی کو اس خوبی اور چابک دستی سے بے نقاب کرتے ہیں کہ قاری کردار دں کے نفس کے مد وجزر کو ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند پڑھ سکتا ہے عسکری کے اسلوب بیان میں برساتی نالوں کی سی روانی اور آتش فشاں لاوے کی تیزی ہے"

"ادب لطیف"

صرف آٹھ افسانے لکھ کر اتنی شہرت حاصل کر لینا اس بات کا ادنیٰ ثبوت ہے کہ عسکری میں کوئی بڑی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ جب عسکری کا پہلا افسانہ کالج سے گھر تک شائع ہوا تو وہی ایک نئے جزیرے کی طرح ادب کی سطح پر ابھر آیا تھا اور تمام پڑھنے والوں نے کوئی نئی چیز پڑھی تھی "پھسلن" "میلاد شریف" "حرام جادی" سب میں نئی باتیں تھیں، نیا طریق اظہار تھا، نئے جزیرے تھے جو سطح پر ابھرتے آتے تھے ..... تحت شعور اور شعور کی جنگ ادب کا بہت اہم موضوع ہے۔ لیکن بہت نازک ہے کیونکہ ذرا سی لغزش میں افسانہ سمتہ بن سکتا ہے۔ عسکری کے افسانے تحت شعور کی طرح بہت حد تک بے ترتیب ہیں لیکن جو ان کا موضوع ہے اس کے لیے ترتیب کی ضرورت ہی کیا ہے ہم اس بے چینی کو دیکھ تو لیتے ہیں جو تمدن کی موجودہ کش مکش نے ان روحوں میں پیدا کی ہے ہم اس نئے راستے کا پتہ تو پا جاتے ہیں جو ایک نئی منزل کا نشان بردار ہے۔

(پروفیسر) احتشام حسین

کتاب ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو، دہلی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com